FICTION HOUSE
سود و زیاں کے درمیاں
(ناول)
خالد فتح محمد

سود و زیاں کے درمیاں

(ناول)
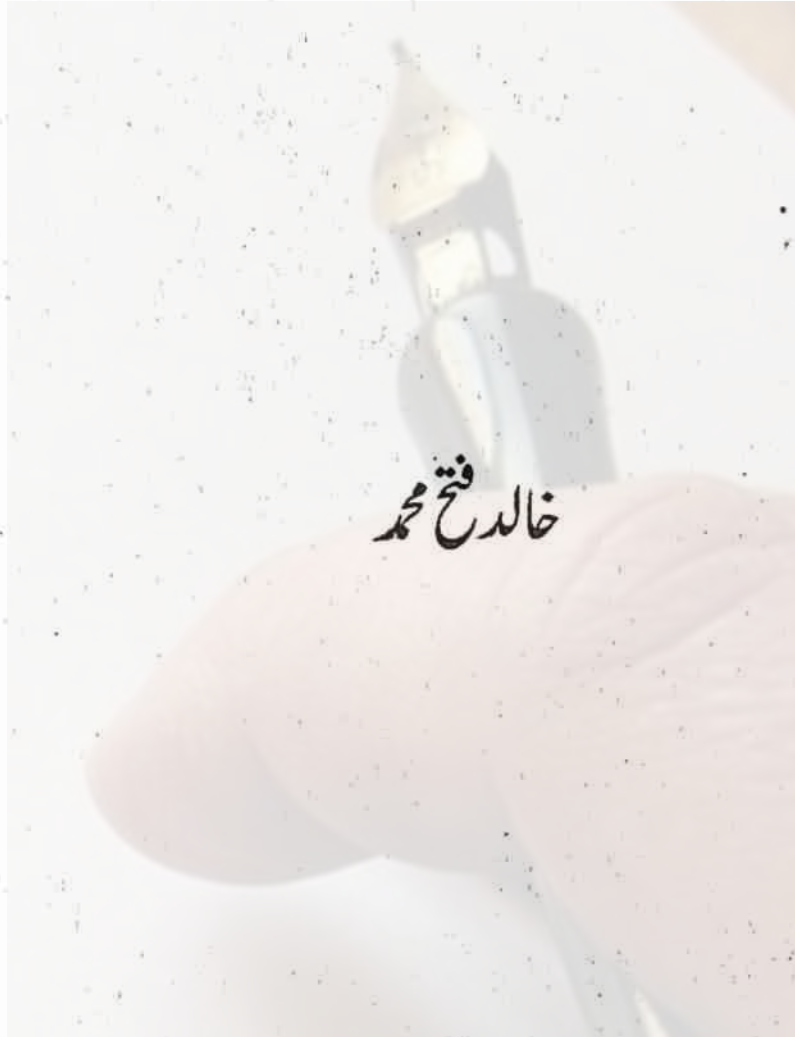
خالد فتح محمد

فکشن ہاؤس
لاہور ○ کراچی ○ حیدرآباد
e-mail: fictionhouse1991@gmail.com

نام کتاب	:	سود و زیاں کے درمیاں (ناول)
مصنف	:	خالد فتح محمد
اہتمام	:	ظہور احمد خاں
پبلشرز	:	فکشن ہاؤس، لاہور
کمپوزنگ	:	فکشن کمپوزنگ اینڈ گرافکس، لاہور
پرنٹرز	:	سید محمد شاہ پرنٹرز، لاہور
سرورق	:	ریاض ظہور
اشاعت	:	2020ء
قیمت	:	-/400روپے

تقسیم کار:

فکشن ہاؤس: بک سٹریٹ 68-مزنگ روڈ لاہور، فون: 042-36307550-36307551

فکشن ہاؤس: 52,53 رابعہ سکوائر حیدر چوک حیدر آباد، فون: 022-2780608

فکشن ہاؤس: نوشین سنٹر، فرسٹ فلور دوکان نمبر 5 اردو بازار کراچی، فون: 021-32603056

لاہور ○ کراچی ○ حیدر آباد ○

e-mail: fictionhouse2004@hotmail.com

’لطیفہ‘ کے لیے
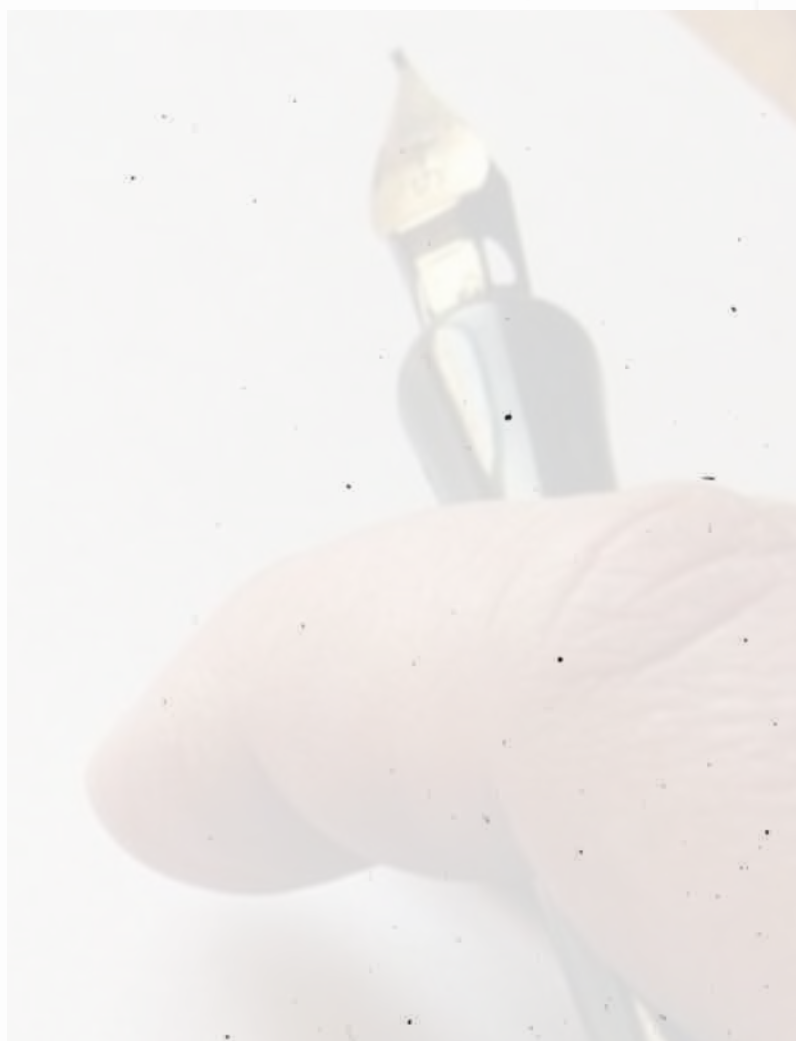
......اُس کا دماغ جاگ چکا تھا لیکن وہ ابھی آنکھیں کھولنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ گدنے گوند کی طرح اُس کی آنکھوں کو جوڑ دیا ہوگا۔ مکھیاں بھی آنا شروع ہوگئی تھیں۔ وہ جانتا تھا کہ مکھی اُسی جگہ بیٹھتی ہے جہاں زیادہ سے زیادہ اُلجھن ہوتی ہے۔ کوئی مکھی نتھنے کے کونے پر بیٹھتی تو محسوس ہوتا کہ چھینک اب آہی جائے گی اور وہ اُسے فوراً اُڑاتا، کوئی مکھی کان کی لو پر بیٹھتی اور سارے بدن میں ایک جھرجھری سی دوڑ جاتی اور اُس کا ہاتھ اُس کان تک پہنچتا تو کوئی اور مکھی آنکھ کے کونے پر اِس طرح بیٹھتی کہ وہاں گدگدی کا احساس ہوتا۔ کچھ دیر کے بعد بند آنکھوں میں روشنی چبھنے لگتی۔ وہ آنکھیں کھولنا نہیں چاہتا تھا۔ گد کی گوند سے جُڑی ہوئی آنکھیں ایک مزہ بھی دیتی تھیں اور بند آنکھوں کو کھول کے اُس نے کرنا بھی کیا تھا؟ سامنے والوں کے چولھے سے رات کی روٹی جواب تک باسی ہوچکی ہوگی، اُسے توے پر پانی کے ساتھ تازہ کر کے کھانے کے لیے دی جاتی تھی۔ اُسے اِس ناشتے سے بہتر وہ ناشتہ لگتا جو وہ جلال پوریوں کی ہٹی پر جا کے کرتا۔ وہ اپنا دِن وہیں گزارتا تھا صرف مفت کی روٹی کھانے کے لیے۔ وہ اُن کا ملازم تو نہیں تھا لیکن دو وقت کی روٹی کے لیے تمام دِن اُن کے کام کرتا۔ نا تو وہ گاہکوں کو سودا دیتا اور نا ہی کسی گاہک کے ہاتھ سے پیسے پکڑتا، اُسے صرف وہ کام کرنا ہوتے تھے جو جلال پوریوں کے کاروبار کا حصہ نہیں تھے۔ وہ اُن کے گھر سے کھانا لاتا، سامنے دودھ دہی کی دکان تھی اور گاؤں کے دودھ کے بیوپاری کچھ دودھ وہاں بیچتے اور باقی اپنے اپنے موٹر سائیکلوں پر شہر لے جاتے۔ وہ دودھ والے سے لے کے اُن کے گھر دودھ پہنچاتا۔

جلال پوریوں کی دکان پر سوائے دودھ، بوتلوں اور پٹرول کے سب کچھ ملتا تھا۔ وہ راہداری کی طرز پر ایک نیم روشن دکان تھی جہاں روزمرہ کا سامان لکڑی کے شیلفوں پر پڑا ہوتا اور باقی چیزیں بوریوں میں ہوتیں۔ وہ دکان دالوں کی چند بوریوں سے شروع ہوئی تھی اور اب علاقے میں سب سے بڑی دکان تھی۔ شہر سے کمپنیوں کی گاڑیاں آتیں اور اپنے اپنے شیلفوں

میں سامان رکھتیں، رقم وصولتیں اور چلتی بنتیں۔ بھائی فقیر حسین کے پاس ایک کتاب تھی جس میں عورتوں کے متعلق معلومات تھیں۔ وہ ایک پرانی کتاب تھی اور کثرتِ استعمال سے اُس کا کاغذ گھس گیا تھا، اب صرف بھائی فقیر حسین ہی اُسے کھولتا یا واپس رکھتا۔ جب بھی کوئی عورت سودا لے کر جاتی، بھائی فقیر حسین فوراً کتاب کھول لیتا۔ وہ عورت کا حلیہ اُس کتاب میں سے دیکھتا اور پھر اُس کے جنسی رجحانات پڑھتا۔ دکان پر آنے والی ہر عورت کے متعلق وہ تفصیل سے پڑھ چکا تھا لیکن پھر بھی اُس کے جانے کے بعد اُس کے ممکنہ التفاتی رجحانات کو تازہ کرتا۔

وہ اپنے بستر سے تب ہی اُٹھتا جب اُسے یقین ہو جاتا کہ بھائی فقیر حسین نے دکان کھول لی ہوگی۔ وہ تب نیچے اُترتا اور آنکھ بچا کے باہر نکل جاتا۔ اُس کی ماں بھی جان گئی تھی کہ وہ پانی لگا کے تازہ کی گئی باسی روٹی کے ناشتے سے بچنے کے لیے جلال پوریوں کی دکان پر پہنچ جاتا ہے۔ وہ بھائی فقیر حسین کے ساتھ مل کے دکان کی صفائی کرتا۔ اُسے صفائی کرنا بالکل پسند نہیں تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ صفائی صرف عیسائی کرتے ہیں اِسی لیے گاؤں میں اُن کی رہائش الگ ہی رکھی گئی تھی۔

ایک بڑا پھاٹک تھا جس کے بعد کھلی ڈیوڑھی جو ایک وسیع صحن میں کھلتی تھی۔ اُس کا گھر اُس وسیع صحن کے تین کونوں میں بنے ہوئے گھروں میں سے ایک تھا۔ چوتھے کونے میں ڈیوڑھی تھی۔ دو گھروں میں پکی اینٹوں سے بنے ہوئے برآمدے تھے جن کے پیچھے ایک ایک کچا دالان اور دونوں اطراف میں کوٹھڑیاں تھیں۔ ایک کوٹھڑی میں اجناس رکھی جاتیں اور دوسری میں بستر، چارپائیاں اور دوسرا سامان رکھا ہوتا۔ اِن گھروں کے سامنے اپنا اپنا چولھا اور بھڑولیاں تھیں۔ تیسرا گھر ایک کچی کوٹھڑی پر ہی مشتمل تھا اور اُس کے سامنے بھی ایک چولھا تھا لیکن باقی گھروں کی طرح بھڑولی نہیں تھی۔ اِن تین گھروں میں بستے خاندانوں کے دادا، آپس میں چچا اور تایا زاد تھے۔

غلام نبی کی علاقے میں اپنی الگ شناخت تھی۔ وہ اردگرد کے بستے ہوئے خاندانوں میں سے بالکل مختلف تھا۔ وہ انگریزوں کا مخالف اور غریبوں کا حامی تھا جب کہ لوگ سرکار کے نا صرف حامی اور وفادار تھے اور اُنھیں غلام نبی کا رویہ پسند نہیں تھا جس کے نتیجے میں وہ ہمیشہ اُن کی زد پر رہا۔ حکومتی اہل کار ہمیشہ غلام نبی کی کھوج میں رہتے۔ عام آدمی انگریز کو اپنی وفاداری ثابت کرنے کے لیے اُس کی مخبری کرتا تھا۔ غلام نبی آزادی کی کسی تحریک یا جماعت کا حصہ نہیں تھا، وہ صرف ملک کو اُن کے تسلط سے آزاد کروانا چاہتا تھا جس کے لیے اُسے فوج اور پولیس میں ملازم

سرکاری ملازموں کی مدد چاہیے تھی جو اُسے بہم پہنچائی نہیں جا رہی تھی۔ غلام نبی نے انگریز سرکار کے خلاف اپنے طور پر اعلان جنگ کیا ہوا تھا۔ گولے خاں کا باپ اُس کا چچا اور مختار خاں کا تایا تھے۔ دونوں سرکار کے ہر قانون کے پابند اور وفاداری نبھانے کا عہد کیے ہوئے تھے جس کے صلے میں اُنھیں نوازا بھی جاتا۔

جب ملک تقسیم ہوا تو غلام نبی کا خاندان ایک طرح کی کس مپرسی کی زندگی گزار رہا تھا جب کہ خاندان کے دوسرے لوگ خوش حال تھے۔ مختار خاں اور گولے خاں کے خاندان آج بھی ایک طرح کی بےفکری کی زندگی گزار رہے تھے۔ اُن کی اپنی اپنی حویلیاں تھیں جہاں اُن کے مویشی بندھے ہوتے۔ اُن کے بچے تعلیم یافتہ اور زندگی کی دوڑ میں آگے نکل چکے تھے۔ دونوں کے تہبند سات گز کپڑے کے ہوتے جسے اُن کے موٹے پیٹوں کے اوپر ناف پر باندھا جاتا۔ تہبند کے لڑ گھٹنوں تک آتے کرتوں سے بھی باہر نکل رہے ہوتے اور جب وہ چل رہے ہوتے تو تہبند زمین پر گھسیٹا جا رہا ہوتا۔ وہ صبح ناشتے پر پراٹھے، بکرے کے گوشت کا سالن، مکھن، دہی، اچار اور میٹھی لسی کے دو جگ پیتے اور جب کوئی مصروفیت نا ہوتی تو ڈیرے پر جا کے سو جاتے۔ گاؤں میں اُن کا دبدبہ تھا اور ہر کام اُن کی اجازت سے کیا جاتا، یہاں تک کہ لوگ اپنے ذاتی کاروبار کے لیے بھی اُن کی اجازت چاہتے۔

جلال پوریوں کی ہٹی بھی اُن کی اجازت سے ہی قائم ہوئی تھی لیکن اُنھیں بھائی فقیر حسین کے باپ کی کاروباری سوجھ بوجھ کا اندازہ نہیں تھا۔ اُس نے اُنھیں پتا چلے بغیر اپنے کاروبار کو اتنا کارگر بنا لیا کہ جب بھائی فقیر حسین نے اُسے سنبھالا تو وہ اُن کے لیے ایک خطر بن گیا۔ اُس کا باپ اپنے کاروبار کو بڑھوتری دیتے ہوئے بظاہر اُن کا وفادار رہا تھا لیکن بھائی فقیر حسین نے بغاوت تو نہیں کی لیکن فیاض خاں کو دکان پر کام کرنے کی اجازت دے رکھی تھی۔ فیاض خاں کے وہاں کام کرنے کے اپنے مقاصد تھے۔ وہ کسی بھی طرح اُن کے خلاف بغاوت نہیں کر رہا تھا، بغاوت تو اُس کے ذہن میں تھی ہی نہیں۔ اُسے دو وقت کا اچھا کھانا چاہیے ہوتا تھا۔

جاگنے کے بعد فیاض نے جب آنکھ کھولنے کی کوشش کی تو اُسے محسوس ہوا کہ اُس کی آنکھیں سی دی گئیں تھیں۔ اُس کے ذہن میں فوراً اپنے دادا غلام نبی کے قصے آ گئے جب انگریز سرکار نے اُس کی زبان کاٹ دی تھی کہ وہ اُن کے خلاف لوگوں اُکسا نا سکے اور دوسرے باغیوں

کے لیے ایک مثال بھی ہو۔ اُس نے انگلیوں کے پوٹوں کی مدد سے آنکھیں کھولیں تو اُسے روز کی طرح اپنے ساتھ والی چارپائی خالی نظر آئی۔ وہ اپنی ماں سے بہت تنگ تھا کہ وہ ہمیشہ پو پھٹنے سے تھوڑا پہلے کیوں جاگ کر جاتی تھی؟ ماں اُسے سمجھاتی بھی کہ اُن دونوں میں فرق ہے۔ عورت کا روشنی ہونے کے بعد چھت پر سوئے رہنا اچھا نہیں لگتا جب کہ اُس کی عمر کے لڑکوں پر ایسی کوئی پابندی نہیں۔ وہ جانتا تھا کہ ابھی بھائی فقیر حسین کی دکان پر ناشتے کا وقت نہیں ہوا تھا۔

فیاض کی ماں ہفتے میں ایک بار دوسرے دونوں گھروں کے چند کام کر آتی جس میں اُن کے میلے کپڑے دھونا اور صفائی کرنا شامل تھے۔ اُن گھروں کی عورتوں کو اجازت نہیں تھی کہ وہ فیاض کی ماں کے ساتھ کوئی بھی رابطہ کریں لیکن دونوں اپنے خاوندوں سے مختلف تھیں۔ انھیں فیاض کی ماں میں کوئی خرابی نظر نہیں آتی تھی اور دونوں اُس کے لیے ہمدردی کا جذبہ رکھتی تھیں۔ وہ اپنے خاوندوں کو پتا چلے بغیر فیاض کے گھر کو دونوں وقت کا کھانا اور دودھ دیتی رہتیں۔

فیاض کو اپنے خاندان کی تاریخ کا تو علم تھا لیکن اُسے ایسے واقعات سے کوئی دل چسپی نہیں رہی تھی جن میں اُس کے دادا کو سورما سمجھا جاتا اور باپ کو ایسا آدمی جو اپنے باپ کے نقشِ قدم پر چلتا رہا۔ فیاض کے لیے اُن قدموں کے نشان مٹ چکے تھے اور وہ ایسی زندگی گزارنا چاہتا تھا جس میں کسی قسم کی کوئی پریشانی نا ہو۔ وہ گولے خاں اور مختار خاں کو ایک پُرسکون زندگی گزارتے ہوئے دیکھتا، ایسی زندگی جس میں نیند ہی نیند تھی۔ اُن کے تہبندوں اور نیند کے، گاؤں میں چٹکلے بنے ہوئے تھے اور وہ بھی اُن کی طرح ہر وقت سوئے ہوئے رہنا چاہتا تھا۔ وہ جب رات کو چھت پر سونے جاتا تو اُسے بعض اوقات نیند نا آتی۔ اُسے حیرانی ہوتی کہ گولے خاں اور مختار خاں کے پاس ایسا کون سا نسخہ تھا کہ وہ جب چاہتے سو جاتے۔ اُس نے اپنی ماں سے ایک بار پوچھا تو اُس نے بتایا:

''اُن کے گھروں میں رات کو دیسی گھی میں چھوٹا گوشت پکتا ہے۔ وہ اپنی پسند کی بوٹیاں نکال کر تازہ اور گرم گرم روٹی کے ساتھ کھاتے ہیں۔ وہ ہماری طرح ایک آدھ روٹی نہیں کھاتے۔ اُن کا کھانا تو کم از کم پانچ آدمی کھا سکتے ہیں۔'' فیاض کو اچانک بھوک کا احساس ہوا اور اُسے یک دم خیال آیا کہ اُس نے اپنی زندگی میں کبھی پیٹ بھر کے کھانا نہیں کھایا تھا اِسی لیے وہ ہر وقت بھوکا رہتا۔ ''پانچ آدمیوں کا کھانا کھا کر وہ گرم گرم دودھ کا ایک بڑا گلاس پیتے ہیں۔ اب جس نے دیسی

گھی میں پکا ہوا چھوٹا گوشت گرم گرم ٹاپ کے ساتھ کھا کے گرم دودھ پیا ہو تو اُسے نیند کیوں نہیں آئے گی؟'' فیاض کو یاد آیا کہ اُس نے تو کبھی گرم دودھ کا گھونٹ بھی نہیں لیا تھا۔ کبھی کبھار اُس کی ماں ساتھ والی عورتوں سے اجازت لینے کے باوجود دودھ ایسے لاتی کہ اُن سے بھی چوری لا رہی ہو۔ دودھ جیسے ہی آتا، وہ پی کے ہی سکھ کا سانس لیتا۔ وہ دودھ کبھی گرم نہیں کیا جاتا تھا کہ گرم کرنے کا وقفہ ہی نہیں میسر ہوتا تھا۔

فیاض کے گھر کی چھت کئی گھروں کی مشترکہ چھت تھی۔ جب ماں سو جاتی تو وہ اپنی چارپائی سے اُتر کر تیلیوں کے گھر میں دیکھتا تو وہاں اکیلے بلب کی روشنی میں اُن کی لڑکیاں گھر کے کاموں میں مشغول نظر آتیں۔ وہ اپنی چارپائی سے اُتر کر چھت پر ایسے آسن میں لیٹ جاتا کہ نیچے سے کسی کو نظر نا آتا اور اُن لڑکیوں کو دیکھتے دیکھتے سو جاتا۔ وہ دونوں لڑکیوں کے حلیوں کی مطابقت سے اُن کے خصائص جاننے کے لیے بھائی فقیر حسین کی کتاب کے کلیے لگاتا رہتا۔ ایک لڑکی کے ہونٹ قدرے موٹے منہ چوڑا اور دائیں گال پر تل تھا۔ کتاب کے مطابق اِس حلیے کی عورت بستر میں آدمی کو نچوڑ جاتی ہے اور وہ ہمیشہ کے لیے کہیں اور نہیں جا سکتا۔ فیاض کو حیرت ہوتی کہ وہ بستر میں آدمی کو کیسے نچوڑ جاتی ہے؟ اُس نے تو اتنا سن رکھا تھا کہ نچوڑا تو لیموں کو جاتا ہے۔ اور پھر وہ کہیں کیوں نہیں جا سکتا؟ کیا اُس کی ٹانگیں مفلوج کر دی جاتی ہیں؟ دوسری لڑکی پہلی کے بالکل برعکس تھی۔ اُس کے ہونٹ باریک اور منہ تنگ تھا۔ کتاب کے مطابق ایسی لڑکیاں سرد اور ہر خواہش اپنے اندر دبائے رکھتی ہیں۔ وہ بنیرے سے تھوڑا ہٹ کے لیٹا ہوا دوسری لڑکی کو چلتے پھرتے ہوئے دیکھتے سوچتا رہتا کہ وہ سرد کیسے تھی؟ اُسے تو وہ ادھر اُدھر چلتے ہوئے معمول کے مطابق لگی، کہیں بھی وہ سرد یا خواہشوں سے خائف نا لگی۔ اُسے وہ بھرے جسموں والی لڑکیاں صحن میں ادھر اُدھر پھرتے ہوئے اچھی لگتیں۔ وہ سوچتا کیا بھائی فقیر حسین کی کتاب اصلی تھی یا یہ دونوں لڑکیاں اور یا دونوں ہی نہیں؟ وہ وہاں لیٹا یہی سوچتا رہتا اور یہی سوچتے ہوئے سو جاتا۔ وہ جانتا ہی نہیں تھا کہ سو رہا ہے یا جاگ رہا ہے؟ رات کے کسی پہر جب اُس کی آنکھ کھلتی تو نیچے صحن میں بتیاں بند ہوتیں اور گھر والے صحن میں اپنی اپنی چارپائیوں پر سوئے ہوتے۔ وہ اندازہ لگاتے ہوئے کہ کون کہاں سوتا ہے پھر سو جاتا اور دوبارہ جب آنکھ کھلتی تو ہلکی ہلکی روشنی پھیلنا شروع ہو چکی ہوتی۔ تب وہ اُٹھ کر چارپائی پر جا لیٹتا۔

بھائی فقیر حسین گاؤں کے امیر آدمیوں میں سے ایک تھا۔اُس کے باپ نے جو کاروبار شروع کیا تھا بھائی فقیر حسین اُسے آگے لیے جا رہا تھا۔وہ گاؤں میں یونین کونسل کے انتخابات میں پرانے نظام کو شکست دینا چاہتا تھا لیکن وہ سوچتا کہ ابھی وقت نہیں آیا کہ کھلم کھلا بغاوت کرے اِس لیے وہ ایک تیز دھار والے پل پر چل رہا تھا۔اُس نے گولے خاں اور مختار خاں کے ساتھ، جنھیں وہ شکست دینا چاہتا تھا، قریبی تعلق رکھا ہوا تھا اور اُن کا مقابلہ کرنے والے لوگوں کی حوصلہ افزائی بھی کیے جا رہا تھا گو سب اِسی تاثر میں تھے کہ وہ ایک کاروباری آدمی تھا۔ڈیرے پر بیٹھنے والے لوگ جو چودھریوں کی زیادتیوں کے خلاف اُٹھ کھڑے ہونا چاہتے تھے، بھائی فقیر حسین کو بتاتے رہتے کہ چودھریوں کو فیاض کا اُس کے پاس کام کرنا پسند نہیں تھا۔ بھائی فقیر حسین کی وجہ سے فیاض کسی حد تک خود مختار ہوتا جا رہا تھا اور اُنھیں خود مختار فیاض کسی بھی طرح وارے میں نہیں تھا کیوں کہ اُس کے اندر نسلاً بغاوت کے جراثیم تھے۔ایک دِن اُنھوں نے بھائی فقیر حسین کو بلا بھیجا جو اُسے پسند نہیں آیا لیکن اُس نے سوچا کہ ابھی بغاوت کا وقت نہیں آیا اور وہ وقت نکال کر ڈیرے پر چلا گیا۔چودھریوں کی پشت پر اُن کی وراثت کی طاقت تھی جس میں غرور زیادہ اور منطق کا شائبہ تک نہیں تھا جب کہ بھائی فقیر حسین کی عاجزی کے پیچھے اُس کے سرمائے کی طاقت کی خاموش للکار تھی۔چودھریوں نے اُسے وہی مقام دیا جو اُن کی نظر میں اُسے ملنا چاہیے تھا۔اُسے آتے ہوئے دیکھ کر دونوں نے آنکھیں بند کر لیں اور تاثر دیا کہ سو رہے ہیں۔ چند لمحے وہاں خاموشی رہی۔وہ لوگ جن کے ساتھ اُن کی گفتگو چل رہی تھی وہ اُس کے اگلے وار کے انتظار میں ہو گئے۔ بھائی فقیر حسین حقہ نہیں پیتا تھا لیکن اُس کے لیے حقہ تازہ کیا گیا؛ کیوں نا کیا جاتا، اُس وقت وہ چودھریوں کا خاص مہمان تھا۔چودھری بند آنکھوں سے یہ سب دیکھے جا رہے تھے۔حقہ جب تازہ ہو گیا تو کسی نے چودھریوں کو جگایا اور اُنھوں نے جاگ جانے کی خام قسم کی اداکاری کرتے ہوئے نیند سے باہر آنے کا دکھاوا کیا اور بھائی فقیر حسین کی طرف سے بھی کچھ ایسے ہی کیا گیا۔

کچھ دیر خاموشی رہی۔

''ہٹی والے!'' گولے خاں نے فیاض کی جتنی تذلیل ممکن تھی، کرتے ہوئے بات شروع کی۔''تمھارے ہاں ہمارا ایک لڑکا آتا ہے۔وہ کچھ پڑھ لکھ تو نہیں سکا لیکن ہم چاہتے ہیں وہ پڑھے۔'' بھائی فقیر حسین فوراً سمجھ گیا لیکن اُس نے بے خبر ہونے کو دانش وری سمجھا۔وہ فیاض کو کسی

مشکل میں ڈالنا نہیں چاہتا تھا لیکن اِن جیسے افراد کی وجہ سے اُسے اہم بھی نہیں بنانا چاہتا تھا۔ اُس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ''پڑھائی کے بغیر آدمی جانور ہے اور ہم اُسے انسان بنانا چاہتے ہیں۔'' بھائی فقیر حسین نے سوچا کہ اب اسے بولنا چاہیے۔

''چودری جی! کس لڑکے کی بات ہو رہی ہے؟'' اُس کی آواز میں جھجک تھی۔

''فیاضے کی۔'' کرخت لہجے میں جواب دیا گیا۔

''وہ دکان میں بیٹھا کام ہوتے دیکھتا رہتا ہے، شاید کبھی اپنا ہی کوئی سلسلہ چلا لے۔'' بھائی فقیر حسین نے سامنے لیٹے دھڑوں کی طرف دیکھا نہیں لیکن وہ اُن کے چہروں کے تاثرات دیکھ سکتا تھا۔ وہ سمجھ سکتا تھا کہ اُن کے ذہن میں فوراً فیاض کا دادا اور باپ آ گئے ہوں گے جن کے اندر بغاوت کُوٹ کُوٹ کر بھری ہوتی تھی اور جنھوں نے اپنی جانیں بھی داؤ پر لگا دی تھیں۔ وہ جانتا تھا کہ اُن پر ایک دم فیاض کی ہیبت طاری ہو گئی ہو گی۔ ''وہ ایک سمجھدار لڑکا ہے اور زندگی کے اُتار چڑھاؤ سمجھتا ہے۔'' اب اُس نے دونوں کی طرف دیکھا۔ وہ اُسے خوف زدہ لگے اور بھائی فقیر حسین نے سوچا کہ وہ چاہتا بھی یہی تھا۔ ''میں اُس کا ہمدرد ہوں لیکن آپ تو اُس کے سرپرست ہیں۔ میں اُسے منع نہیں کر سکتا، یہ آپ ہی کو کرنا ہو گا۔'' وہ خاموش ہو گیا۔ اُسے بچپن سے بتایا گیا تھا کہ جب کوئی سودمند سودا طے ہو جائے تو فوراً اُٹھ جانا چاہیے۔ وہ مزید کچھ کہے بغیر یا اُن کا جواب سننے سے پہلے ہی اُٹھ گیا۔ وہ جب دکان پر پہنچا تو فیاض نے اُس کی غیر حاضری میں کام سنبھالا ہوا تھا۔ وہ کچھ بیچ تو نہیں رہا تھا لیکن اُس نے کسی گاہک کو جانے نہیں دیا تھا۔ اُس نے سب کا سامان اُن کی مانگ کے مطابق رکھ کے کسی کے حوالے نہیں کیا تھا۔ بھائی فقیر حسین کو یہ دیکھ کر خوشی ہوئی لیکن اُس نے چودھریوں کے ساتھ ہونے والی بات چیت کے بارے میں فیاض کو نا بتانے کا فیصلہ کیا۔ وہ اُنھیں کسی بڑے مسئلے میں اُلجھا کے اُن کی برتری کو ختم کرنا چاہتا تھا۔

اگلی صبح بھی فیاض کی آنکھیں بند تھیں اور اُسے اُنھیں کھولنے میں دقت ہوتی تھی۔ وہ رات کو جلد سو گیا تھا اور نیند لانے کے لیے اُسے نیچے گھر والی لڑکیوں کو بنیرے کی اوٹ سے دیکھنے کی ضرورت پیش نہیں آئی تھی۔ وہ روز کی طرح روشنی ہونے کے انتظار میں تب تک لیٹا رہا تھا، جب اُسے یقین ہو گیا کہ اُس کی ماں چولھے پر مصروف ہو گئی ہو گی اور اُسے چپکے سے باہر نکلنے میں دقت نہیں ہو گی، وہ بغیر کوئی آواز پیدا کیے صحن میں سے نکل کر ڈیوڑھی میں داخل ہوا تو گولے خاں اور

مختار خاں دو چار پائیوں پر وہاں بیٹھے ہوئے تھے جو فیاض کو عجیب سا لگا۔ وہ اُن کو نظر انداز کر کے پاس سے گزرنے لگا تو گولے خاں نے گلا صاف کیا:

''فیاضے!'' فیاض رُک گیا۔ وہ اُنھیں دیکھتے ہی ہمیشہ خوف زدہ ہوتا آیا تھا۔ اُس نے بے یقینی کے ساتھ اُنھیں دیکھا۔ اُسے لگا کہ وہ دونوں اُسے گھور رہے ہیں۔ ہمیشہ کی طرح وہ خوف زدہ ہو گیا۔ وہ اُن کے سامنے کھڑا ہو گیا لیکن کچھ بولا نہیں۔

''نائی کی ہٹی پر جا رہے ہو جو اپنے آپ کو گورا ئیہ کہتا ہے۔'' فیاض نے تھوک نگلا۔ اُسے بھوک لگنا ابھی شروع ہوئی ہی تھی۔ تھوک نگلتے ہوئے اُس نے اثبات میں سر ہلایا۔

''اب تم وہاں نہیں جاؤ گے۔ اُس کی مدد کرتے ہو تو ڈیرے پر جا کے ہمارے کام آؤ۔ دونوں وقت دودھ گھر پہنچایا کرو اور مہمانوں کا کھانا پانی بھی۔''

فیاض نے پھر اثبات میں سر ہلایا۔ وہ دونوں اُٹھ کر باہر چلے گئے اور فیاض اپنے آنسو روکتا ہوا واپس چولھے کی طرف چل پڑا۔ اُسے اب پانی میں تلی ہوئی رات کی باسی روٹی کھانی پڑا کرے گی۔ ڈیرے میں کوئی رونق ہی نہیں ہو گی جو بھائی فقیر حسین کی دکان پر ہوا کرتی تھی۔ کوئی عورت قیمت پر جھگڑا کر رہی ہے تو کوئی خریدا ہوا سودا واپس کرنے کے لیے جھگڑ رہی ہے۔ کسی کو جلدی ہے تو کوئی شور کر رہی ہے کہ اُسے ابھی تک سودا نہیں دیا گیا اور ایسے کئی دل چسپ واقعات جو روز ہوتے تھے اور پھر وہ کتاب جو بھائی فقیر حسین پڑھ کر سناتا تھا اور جس کی تفصیل وہ رات کو پڑوسیوں کی لڑکیوں پر لگاتا تھا۔ اب تو صرف ڈیرا ہو گا اور وہاں کی پھس پھسی زندگی اور یہ دو دھڑ جو کہیں آتے جاتے نہیں تھے اور ہر کام لیٹے لیٹے ہی پیغاموں کے ذریعے کرواتے تھے۔ فیاض نے سوچا: وہ وہاں کیسے جائے؟ اگر گیا تو کیا کہے گا؟ کسی چار پائی کی پائینتی پر بیٹھ جائے؟ پائینتی پر تو اُن کے کم تر لوگ بیٹھتے ہیں اور وہ جو خاندانی طور پر اُن کے برابر تھا اب اُن کی پائینتی پر بیٹھا کرے گا؟ لوگ اُن کے بارے میں صحیح کہتے ہیں کہ وہ اُسے نیچ سے نیچ بنائے جا رہے تھے۔ کیا وہ اُن کا کارندہ بن کر ہی زندہ رہے گا؟ فیاض کو خیال آیا: لوگ کہتے ہیں کہ اُس کے دادا نے انگریزوں کے خلاف بغاوت کی تھی اور اپنی جان دینے سے بھی دریغ نہیں کیا تھا اور باپ نے ظالم حاکم کے خلاف جدوجہد میں جان دینا اپنا فرض سمجھا تھا۔ وہ چولھے کے سامنے بیٹھا تھا اور ماں گیلے اُپلوں کو سلگانے کی کوشش میں دھوئیں کی وجہ سے آئے آنسوؤں کو صاف کیے جاتی تھی۔ اُسی وقت گولے خاں کی

بیوی آئی اور کچھ رکھ کے جلدی سے مڑ گئی۔ ڈیوڑھی کا دروازہ کھلا تھا اور وہ ڈیوڑھی کی طرف ایک نظر ڈال کر اپنے چولھے کے پیچھے چھپ گئی۔ ماں نے چھابے میں رکھے پونے کو کھولا تو اُس میں ایک پراٹھا، انڈا اور گوشت دو کولیوں میں رکھے ہوئے تھے۔

''تمھارے لیے دے گئی ہے۔'' ماں نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

''میں نہیں کھاؤں گا۔'' فیاض کی آواز میں غصہ تھا۔ ماں ایک دم خوف زدہ ہوگئی۔ اُسے فیاض کی آواز میں اُس کے باپ کی گونج سنائی دی۔ اُس نے گیلے اُپلوں کے دھوئیں سے آنکھوں میں آئے آنسو پھر صاف کیے تو وہاں اپنے خاوند کی یاد کے آنسو بھی پونچھے گئے۔ ''باسی روٹی توے پر پانی کے ساتھ گرم کر دو۔ وہی کھالیں گے دونوں۔ اِس کی ضرورت نہیں۔'' اُس نے پڑوسیوں کے ناشتے کی طرف اشارہ کیا۔ ''شام کو بھائی فقیر حسین کی دکان سے آٹا اور گھی لے آؤں گا۔ اپنا پراٹھا کھایا کریں گے۔'' فیاض کو اپنی ہی آواز میں ایک طاقت کا احساس ہوا۔ وہ سامنے بیٹھی ماں سے کسی وجہ سے شرمندہ بھی ہوا۔ اُسے اِس طرح بات کرنا گستاخی لگا۔ اُس نے ماں کی بات کو کبھی رد نہیں کیا تھا۔

''وہ تو کمینے قسم کے لوگ ہیں۔ اُنھیں پیسے کہاں سے دیں گے؟'' ماں کی آواز میں ایک طرح شک کا شائبہ تو تھا لیکن خوشی بھی چھلک رہی تھی۔ ''جنھوں نے اُدھار پر لیے سامان کے پیسے نا دیے ہوں وہ اُن کے گھروں کے چکر لگاتے رہتے ہیں۔'' ماں نے توے پر تھوڑا سا پانی ڈالا اور پھر باسی روٹی اور اُسے اُلٹنے کے بعد چھابے میں رکھ کے فیاض کی طرف بڑھا دی۔

''وہ اتنے بُرے نہیں جتنے لوگ کہتے ہیں۔ ماں! وہ پیسے والے ہیں۔ دکان میں ایک ٹیلی فون لگا ہوا ہے جس پر وہ گھر بات کرتے ہیں۔ ایک اور ٹیلی فون ہے جس پر کمپنیوں کو مال لانے کا کہتے ہیں۔ مجھے وہ گھر کا آدمی ہی سمجھتے ہیں اور بہت سی باتوں پر میرے ساتھ مشورہ بھی کرتے ہیں۔'' ماں قہقہہ لگا کے ہنس پڑی۔ اُس کے قہقہے میں خوشی زیادہ اور بے یقینی کم تھی۔ ''دوسری روٹی نا لو۔ یہی آدھی آدھی کر لیں گے۔''

''مجھے خوشی ہوئی لیکن تو ابھی بچہ ہے، لوگوں کی چالیں کہاں سمجھے گا؟''

''پیٹ کی بھوک عمر سے پہلے بڑا کر دیتی ہے۔ میں تیرے جتنا بڑا ہوں۔''

فیاض جب ڈیوڑھی میں گیا تو وہ مطمئن تھا اور اُس نے دونوں کا مقابلہ کرنے کی ٹھان لی

تھی۔اُس نے گھر سے ڈیرے تک کا فاصلہ بغیر کسی جلدی کے طے کیا۔وہ راستے میں کافی دیر چوک میں کھڑا رہا اور وہاں لوگوں کو آتے جاتے دیکھتا رہا۔ابھی مویشیوں کو چھوڑنے کا وقت نہیں ہوا تھا اِس لیے چوک میں گہما گہمی نہیں تھی......بس لوگ آ اور جا رہے تھے۔اُس کی عمر کے چند لڑکے ایک دوسرے کے پیچھے بھاگ رہے تھے اور گالیاں دیے جا رہے تھے۔وہ اُنھیں خوشی اور حیرت سے دیکھتا رہا۔اُس کا جی بھی اُن میں شامل ہونے کو کر رہا تھا لیکن اُس نے سوچا کہ اُس کے پاس تو اتنا وقت ہی نہیں۔وہ ڈیرے کی طرف چل پڑا۔ جب وہاں پہنچا تو وہ دونوں آنکھیں بند کیے ہوئے لیٹے تھے اور وہ سامنے سے دور پڑی چار پائی پر بیٹھ گیا۔وہاں چند حاشیہ بردار بیٹھے ہوئے تھے جنھوں نے اُسے غور سے دیکھا، ایک دوسرے کو دیکھا اور پھر اُن نیم خوابیدہ یا نیم بیدار دھڑوں کو دیکھا اور باتوں میں مصروف ہو گئے۔دونوں میں سے ایک نے حقے کا کش لیا اور تھوڑا سا کھانسا:

''فیاضے! حقے بھرو۔'' فیاض کو یہ ایک بزرگ کی خواہش کے بجائے اپنی تضحیک لگی۔ ڈیرے پر اگر وہ فیاضے تھا تو وہ بھی گولو اور مختارو تھے۔فیاض نے چاروں طرف دیکھا اور سینہ تان کر کھڑا ہوا، ایسے کہ جس طرح ملازم یا حاشیہ بردار کھڑے نہیں ہوتے۔پاس بیٹھے ہوئے لوگوں نے بھی محسوس کیا۔اُس نے آگے بڑھ کے چلم کو اُٹھایا اور وہاں بیٹھے ایک آدمی کو آنکھ کے اشارے سے حکم دیا کہ وہ جلدی سے چلم بھر لائے اور خود وہیں بیٹھا رہا۔

فیاض نے اُن کے گھر سے آیا کھانا نہیں کھایا اور اُسے بھوک بھی نہیں لگی ہوئی تھی۔وہ ایک ہی جگہ پر بیٹھا کبھی اُن کی باتیں سنتا اور کبھی اپنے ہی خیالوں میں کھو جاتا۔دِن ڈھلنا شروع ہو گیا اور یہ وہ وقت تھا جب بھائی فقیر حسین فارغ ہوتا اور اپنی کتاب نکال لاتا۔وہ پڑھتا جاتا اور فیاض اُس کے پڑھنے میں سے اپنے مطلب نکالتا جاتا اور بھائی فقیر حسین کے ساتھ تبادلۂ خیال کرتا جاتا۔وہ اپنے انہیں خیالات میں گم اونگھ میں چلا جاتا اور کوئی قہقہہ یا کسی چار پائی کو گھسیٹے جانے کی آواز اُسے جگا دیتی۔

''فیاضے! گھروں سے برتن لا کے دودھ نکلوا اور گھر پہنچا۔'' اِس حکم نے اُسے چوکنا کر دیا۔دودھ والے برتن لانا اُسے اپنی عزتِ نفس پر حملہ لگا۔اُس نے چار پائیوں پر بیٹھے ہوئے چند لوگوں کو دیکھا اور اُن میں سے ایک کو، جو جلال پوریوں کی ہٹی پر اکثر جایا کرتا تھا، گھر کی طرف

جانے کا اشارہ کیا اور خود حویلی کی طرف چل پڑا۔ وہ طویل عرصے کے بعد حویلی گیا تھا۔ اُسے وہاں کوئی تبدیلی نظر نہیں آئی۔ وہ کچھ دیر کھڑا ہر طرف دیکھتا رہا۔ تب تک وہ آدمی ایک بڑی بالٹی اور ولٹوئی لیے آ گیا۔ برتن دیکھتے ہی ایک اور آدمی وہاں پہنچ گیا اور اُس نے ایک کٹا بھینس کے نیچے چھوڑا اور پھر کٹے کو اُس کی جگہ پر باندھ کر خود نیچے بیٹھ گیا۔ فیاض بھی دل چسپی سے نزدیک ہو کے بیٹھ گیا۔ اُس آدمی نے تھن سے ولٹوئی میں ایک دھار ماری۔ خالی برتن میں دودھ کی تیز دھار کی آواز خالی برتن کے اندر کنکری کے گرنے جیسی تھی۔ جیسے جیسے دودھ میں اضافہ ہوتا گیا، دودھ کی دھار کی ولٹوئی میں گرنے کی آواز بھاری ہوتی گئی اور یہ آواز اُسے اپنی چھاتی کے اندر تتلی بناتے ہوئے محسوس ہوئی۔ اُسے لگا کہ وہ یہ آواز سنتے ہوئے گہری نیند میں ڈوب سکتا ہے۔ فیاض نے سوچا: وہ اگر یہ آواز نا سنتا تو ایک ایسی گونج سننے سے محروم رہتا جس نے اُس کی چھاتی کو ایک نئی دنیا سے بھر دیا تھا۔ اُس نے ہر چوائی پر موجود ہونے کا فیصلہ کر لیا۔

دودھ گھروں تک پہنچانا ایک مسئلہ تھا۔ اُس نے سوچا دودھ کے گھروں تک پہنچانے تک راستے میں ملاوٹ بھی کی جا سکتی ہے، اِس لیے کسی کے حوالے کر دینے کے بجائے دودھ ہی خود لے جانا بہتر تھا۔ اُس نے ولٹوئی سر پر رکھوائی۔ وہ اپنی عمر کے لڑکوں کو اِس طرح برتن، چارہ، آٹے کا توڑا یا کوئی اور وزن سر پر رکھے، بغیر کسی دقت کے، کہیں آتے یا جاتے دیکھتا رہا تھا اِس لیے اُس نے خود ہی اُٹھانے کا فیصلہ کر لیا تھا ورنہ وہ جان چکا تھا کہ کسی حاشیہ بردار کو ایک لاتعلق سی برتری کا اشارہ کافی ہوتا تھا۔ ولٹوئی اُس کے سر پر ٹکتی نہیں تھی اور وہ ڈگمگاتے ہوئے جا رہا تھا جب کہ ایک ہاتھ میں بالٹی بھی تھی۔ تھوڑا چلنے کے بعد وہ رکتا اور بالٹی والا ہاتھ جواب تھک چکا ہوتا، اُس سے دوسرے ہاتھ میں منتقل کر کے پھر سے ڈگمگاتے ہوئے چل پڑتا۔

دودھ کی دکان والا لوگوں کے گھروں اور حویلیوں سے دودھ اکٹھا کر کے مسکرا کر دیکھتے ہوئے اُس کے پاس سے گزرتا۔ فیاض جانتا تھا کہ دودھ والا بھائی فقیر حسین کو اُس کی اِس مشقت کے بارے میں بتاتا ہو گا؛ وہ سوچنے کی کوشش کرتا کہ بھائی فقیر حسین کے تاثرات کیا ہوں گے؟ وہ کچھ فیصلہ نا کر پاتا۔ وہ جانتا تھا کہ اُس کے تاثرات کی کوئی پیشین گوئی نہیں کی جا سکتی، وہ پریشان ہونے سے خوش ہونے تک کچھ بھی کر سکتا تھا۔ ولٹوئی اُٹھانا اُس کے لیے اب تک وہی مسئلہ تھا؛ وہ پہلے دن کی طرح ڈگمگاتے ہوئے ہی چلتا۔

فیاض اب گھر ہی کھانا کھاتا۔ دوپہر اور شام کو وہ پانی کے ساتھ ایک روٹی کھاتا اور صبح پراٹھا۔ ساتھ والی عورتیں سالن، چاول، کھیر یا دال.... جو بھی اُن کے پکتا، ماں کو دے جاتیں لیکن فیاض اُن سب پکوانوں کو چکھتا تک بھی نہیں تھا۔ اب دودھ والا اُسے دیکھ کے رُک جاتا اور چند باتیں بھی کرتا۔ دودھ والے سے چند باتیں کرنا اسے مزہ بھی دیتا کیوں کہ ڈیرے پر اُس کی کبھی کسی سے کھل کر بات نہیں ہوئی تھی۔ ایک دِن دودھ والا اُس کے انتظار میں تھا اور اُس نے اُسے رکنے کا اشارہ کیا۔

''دودھ گھر پہنچانے میں، مَیں تمھاری مدد کر سکتا ہوں۔ لاؤ ادھر!'' فیاض نے غور سے اُس کی طرف دیکھا۔ اُسے حیرانی بھی ہوئی اور کچھ اُمید بھی۔ اُس نے دودھ والے کی مدد کی پیش کش کے پیچھے چھپے مقصد کو جاننے کا فیصلہ کر لیا۔

''کوئی مسئلہ نہیں مجھے، میں تو روز ہی لے کر جاتا ہوں۔'' فیاض نے اپنی سانس درست کرتے ہوئے کہا۔

''مجھے معلوم ہے کہ کوئی مسئلہ نہیں۔ بھائی فقیر حسین نے کہا ہے میں کچھ دودھ نکال کر اپنی ڈرمی میں ڈال لیا کروں گا اور اُتنا ہی پتلا دودھ تمھارے برتنوں میں ڈال دیا جائے گا۔ اِس دودھ کی قیمت سے آنٹے کے توڑے اور گھی کی قیمت کٹتی جائے گی۔'' اُسے ماں کی بات یاد آ گئی۔ ''دراصل اِن چودھریوں کو ہر طرح نقصان پہنچانا ہے۔'' اب فیاض کو حوصلہ ہوا کہ وہ اکیلا نہیں تھا۔ ''تم اگلے چند دنوں میں کسی رات بھائی فقیر حسین سے مِل لینا، کسی کو پتا نا چلے۔'' یہ کہہ کے اُس نے ولٹوئی اور بالٹی خود اُٹھا لیں اور ارد گرد دیکھتے ہوئے دونوں برتنوں میں سے لیٹر کے چار گلاس اپنے ایک ڈرم میں ڈالے اور دوسرے ڈرم سے اُتنی ہی تیزی کے ساتھ دو، دو گلاس ولٹوئی اور بالٹی میں ڈالے۔ ''چند دِن برابر کا دودھ ہو گا پھر دو گلاس۔'' دودھ والا اب برتن اُٹھا کے گھروں کی طرف چلا گیا اور فیاض کو موٹر سائیکل کے پاس کھڑے رہنے کا اشارہ کر گیا۔

اگلی رات فیاض، بھائی فقیر حسین سے ملنے گیا۔ اُس نے دودھ والے کی معرفت اپنے آنے کی اطلاع کر دی تھی۔ بھائی فقیر حسین اُسے دکان پر نہیں ملا، وہ گھر میں اُس کے انتظار میں تھا۔ وہ فیاض کے ساتھ اپنایت سے ملا اور محبت کے اظہار کے لیے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ فیاض نے شربت پیا اور بعد میں مرغی والا پلاؤ خوب پیٹ بھر کے کھایا۔ اُسے کھاتے ہوئے ماں کا خیال

آیا جو چولھے کے پاس اُس کے انتظار میں بیٹھی ہوگی۔ اُس نے سوچا: کیا اچھا ہوا گر اُسے ماں کے لیے بھی کچھ دے دیا جائے! کھانا خاموشی میں کھایا گیا۔ فیاض کو ڈیرے اور حویلی میں اپنے مقام کی تجالت بھی خاموش رکھے ہوئے تھی۔ کھانے کے بعد بھائی فقیر حسین نے سگریٹ سلگایا۔

"کچھ باتیں بھی ہونی چاہئیں۔ چپ بیٹھنے کے لیے تو ہم نہیں ملے۔" بھائی فقیر حسین ہلکے سے ہنسا اور جواب میں فیاض مسکرا دیا۔ اتنا پیٹ بھر کے کھانے سے اُسے نیند کے جھونکے بھی محسوس ہونے لگے تھے۔ "چھوٹے الیکشن آرہے ہیں اور گاؤں نے فیصلہ کیا ہے کہ تمھارے سرپرستوں کو ہرانا ہے۔ اِس فیصلے کے باوجود اُنھیں ہرانا اتنا آسان نہیں۔ لوگ اُنھیں ووٹ دینا نہیں چاہتے لیکن پھر بھی دیں گے اور ہم نے اُنھیں دینے سے روکنا ہے۔ اگر ہم یہ ایک بار کر گئے تو اُن کا گاؤں سے جنازہ اُٹھ جائے گا جو اُٹھایا جانا ضروری ہے۔" بھائی فقیر حسین نے بات ختم کر کے ایک کش لیا۔ فیاض کی اب نیند اُڑ گئی تھی اور وہ باقی بات سننے کے لیے بیتاب تھا۔ اُس نے الیکشن ہوتے کبھی دیکھے نہیں تھے اور الیکشنوں کی بات سُن کر وہ ایک دم چوکنا ہوگیا۔ اُس کی نیند کے جھونکے ایک دم غایب ہوگئے۔ "تم نے ڈیرے میں ہر آنے والے اور ہر ملاقات کی خبر رکھنی ہے۔" بھائی فقیر حسین ایک بار پھر رکا اور اُس نے کسی طرف اشارہ کیا۔ تھوڑی دیر بعد بھائی فقیر حسین کی بیوی دودھ کے دو گلاس لیے ہوئے آئی اور جاتے ہوئے اُس کی جیب میں کچھ نوٹ ڈال گئی۔ "پریشانی کی بات نہیں۔ تم مہمان ہو اور بیٹے بھی۔ دودھ پیو۔" وہ ہنسا، "یہ تمھارے وارثوں کا ہے۔" فیاض بھی شرمندہ سا ہنس پڑا۔ "لوگوں نے بہت سے بدلے لینے ہیں اور تم بھی اپنا بدلہ لوگے۔ اُنھیں قتل کرنے کا مقصد نہیں، ہم نے اُن کی ساکھ ختم کرنی ہے۔" فیاض کا ذہن بھائی فقیر حسین کے منصوبے کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا اور گرم دودھ کے گھونٹ اُسے ایک بار پھر غنودگی کی طرف دھکیل رہے تھے۔ "تم نے بس ہر چیز پر نظر رکھنی ہے اور خود کسی بھی بات چیت میں شامل نہیں ہونا۔ چودھریوں کو کبھی شک نہیں ہونا نہیں چاہیے کہ تم اُن کے ساتھ نہیں ہو۔" بھائی فقیر حسین اُٹھ کھڑا ہوا۔ فیاض ابھی کچھ دیر اور ٹھہرنا چاہتا تھا لیکن اب اُسے جانا ہی تھا۔ اُسے اپنی اہمیت اچھی لگی اور وہ الیکشن کے بارے میں باتیں سننا چاہتا تھا۔

فیاض کو اب جانا ہی تھا!

فیاض نے پہلے اپنی ماں کے لیے پلاؤ مانگنے کا سوچا لیکن پھر اُسے مانگنا مناسب نا لگا۔

اُس نے سوچا کہ وہ اب اتنا اہم ہوگیا ہے کہ اُسے درخواست کرنا مناسب نا لگا۔ اُسے لگا کہ اب وہ بھائی فقیر حسین کے برابر ہی پہنچ چکا ہے، اُسے یہ بھی احساس تھا کہ وہ اُس کے لیے کام کر رہا ہے۔ وہ سر جھکائے گھر کی طرف چلتا رہا اور بار بار جیب میں پڑے ہوئے نوٹوں کو محسوس کرتا۔ وہ جب گھر پہنچا تو ماں چھت پر جا چکی تھی اور اُسے ڈیوڑھی کا دروازہ بند کرنے یا نا کرنے کے بارے میں بتایا نہیں گیا تھا اِس لیے وہ بند کیے بغیر ہی اوپر چلا گیا۔ ماں اُس کے انتظار میں جاگ رہی تھی۔ وہ ایک بھاری پن کے ساتھ چارپائی کے اوپر لیٹ گیا۔ ٹھنڈے بستر نے اُسے ایک سکون دیا۔ وہ بھائی فقیر حسین کے گھر سے آتے ہوئے اپنی جیب میں پڑے نوٹ محسوس کرتا آیا تھا اور لیٹتے ہی وہ اُنھیں بھول گیا۔ ماں کے ہلکے ہلکے خراٹے اُس کی نیند میں مخل ہو رہے تھے۔ ہوا مند مند چل رہی تھی اور وہ بھی سونے کے لیے بے چین تھا لیکن اُسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ نیند لانے کے لیے اُس نے موچیوں کے بنیرے سے اُن کے صحن میں جھانتے کا بھی سوچا لیکن اُسے پھر ایسا کرنا مناسب نہیں لگا۔ اِسی طرح کروٹیں لیتے ہوئے اُس کا ہاتھ جیب کو لگا اور اُسے وہ روپے محسوس ہوئے۔ فیاض نے اُن روپوں کے بارے میں پہلی بار غور کیا۔ وہ اُن کا کیا کرے؟ کیا اُنھیں جیب میں پڑا رہنے دے اور اِسی طرح محسوس کرتے ہوئے کسی دِن جیب سے گر جانے دے؟ یا کچھ نا کچھ خرید کر اپنی ذات پر خرچہ کرتا جائے؟ اُسے یہ اپنی معصوم اور بے ضرر ماں کے ساتھ ناانصافی لگی۔ جب گھر میں پیسے نام کی کوئی چیز نہیں تھی تو اُس نے ہی تمھیں حوصلہ دیا اور زندہ رکھا۔ فیاض نے اُس گہرے اندھیرے میں مسکراتے ہوئے سو سو کے دونوں نوٹ ماں کے ڈنڈے جیسے تکیے کے نیچے رکھ دیے۔ اُس نے ماں کے چہرے کے تاثرات کل دیکھنے کا فیصلہ کیا۔ فیاض کسی حد تک مطمئن تھا اور پریشان بھی۔ ماں کو کیا بتائے گا کہ پیسے کہاں سے آئے؟ اگر اُس نے بتایا کہ بھائی فقیر حسین کی بیوی اُس کی جیب میں ڈال گئی تھی تو ماں نے کرید کرید کر اُس سے سب کچھ اگلوا لینا تھا اور عین ممکن تھا کہ وہ دونوں موٹوں کی بیویوں کو پیشگی انتباہ کر دیتی اور بھائی فقیر حسین کا بنا ہوا کھیل بگڑ جاتا۔ اُس نے سوچا کہ وہاں سے روپے اُٹھا کر جیب میں ڈال لے اور ماں کو پتا چلے بغیر استعمال کے لیے چند چیزیں خرید لے۔ اُس نے ہاتھ بڑھا کے نوٹ اُٹھانا چاہے تو اُسی وقت ماں نے کروٹ لی اور نوٹ اُس کے نیچے آ گئے۔ فیاض نے فیصلہ کیا کہ وہ ماں کو بتائے گا کہ نوٹ کسی کی امانت تھے اور اِس سوچ کے ساتھ ہی وہ گہری نیند میں ڈبکی لگا گیا۔

صبح اُسے جلدی اُٹھنا پڑتا تھا کیوں کہ بھینسوں کی چوائی اُس کے ذمے تھی۔ وہ اُن دونوں کو کوئی شکایت کا موقع نہیں دینا چاہتا تھا۔ دودھ نکالنے والا اُس کے انتظار میں تھا اور فیاض کو دیکھتے ہی اُس کے ہونٹوں پر بے ساختہ قسم کی ہنسی پھیل گئی۔ وہ جب گھر سے نکلا تو ماں اُسے کہیں نظر نہیں آئی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ فیاض دودھ پہنچنے کے بعد ناشتہ کرتا تھا اِس لیے اُس نے ابھی تک چولھا سلگایا نہیں تھا۔ فیاض نے جاگتے ہی ماں کے بستر کی طرف دیکھا، چارپائی خالی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ ماں ہمیشہ دری، کھیس اور تکیے کو جھاڑ کے بستر اکٹھا کرتی تھی۔ اُس نے ادھر اُدھر دیکھا، اُسے چارپائی کے اردگرد نوٹ نظر نہیں آئے۔ وہ سمجھ گیا کہ ماں اُنھیں لے گئی ہے۔

فیاض دودھ نکالنے والے کے پاس بیٹھا ولٹوئی میں تھنوں کی دھاروں سے بجتی گھوکر کو اپنی چھاتی میں محسوس کر رہا تھا کہ اُس کا سلسلہ ٹوٹ گیا:

''اوئے فیاض! سنا تم نے؟'' فیاض نے پہلے حیرانی اور بعد میں ناپسندیدگی کے ساتھ اُس کی طرف دیکھا۔ کچھ دنوں سے اُسے ''اوئے'' اور ''فیاضیا'' کہلایا جانا پسند نہیں آ رہا تھا۔ وہ ابھی کسی کو اپنی حیثیت یا ارادوں کے بارے میں پتا نہیں چلنے دینا چاہتا تھا۔ وہ صرف مناسب وقت کے انتظار میں تھا۔ وہ خاموشی سے دودھ نکالنے والے کو دیکھتا رہا جو کبھی ولٹوئی میں دودھ کی دھار کو دیکھتا اور کبھی فیاض کے چہرے کو۔ ''سنا ہے الیکشن آ رہے ہیں۔''

''اچھا!'' فیاض نے عدم دل چسپی سے کہا۔ وہ ڈیرے پر پچھلے چند دنوں سے اِس قسم کی باتیں سن رہا تھا لیکن اُن دونوں میں سے کسی نے کوئی رائے نہیں دی تھی۔

''سنا ہے کہ اِس بار چوریوں کے بندے کے مقابلے میں کوئی غریب کھڑا ہو رہا ہے۔'' فیاض کے بدن میں خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ اُسے اپنی منزل سامنے نظر آتے محسوس ہوئی۔ منزل سے تھوڑا پہلے اُسے اپنا دادا کھڑا نظر آیا اور ساتھ ہی باپ۔ وہ دونوں اُس کی طرف فخر سے دیکھ رہے تھے۔ اُس نے سوچا کہ وہ بھی اُن کے سفر کی طرف چلنے والا ہے۔ اُسے لگا کہ باپ اور دادا ابھی منزل پر پہنچے نہیں، تھوڑے سے فاصلے پر کھڑے ہیں اور وہ اُس کے انتظار میں ہیں کہ تینوں وہاں اکٹھے جائیں۔ اُسے حیرت ہوئی کہ اُن کے ساتھ ماں اور دادی نہیں تھیں۔ ''یہ بھی سنا ہے کہ چوہدری اُس پر کوئی مقدمہ بنوانا چاہتے ہیں۔'' فیاض نے کوئی جواب دینا مناسب نہیں سمجھا۔ وہ تو اپنے ہی خیالوں میں گم تھا۔ کیا مقدمہ اُن دونوں کے مخالفوں کے حوصلے پست کر دے گا؟ کیا وہ مخالفوں کے

ساتھ شامل ہو جائے؟ پھر اُسے خیال آیا کہ بھائی فقیر حسین نئی ہدایات بھیج دیں گے؛ اُسے انتظار کرنا چاہیے۔

دودھ نکالنے والا اب دوسری بھینس کے نیچے جا بیٹھا تھا اور ولٹوئی میں ہی دودھ نکال رہا تھا۔ اُس کی چھاتی کے خالی پن کو دھاروں کی گھوکر بھر تو رہی تھی لیکن اُسے خالی برتن میں پہلی چند دھاریں سننے کا بھی اُتنا ہی اشتیاق رہتا۔ اُسے وہ دھاریں کانچ کے اُس خالی گلاس کے ڈیرے کے فرش پر گرنے کی یاد دلا دیتیں جو اُن کے ایک حاشیہ بردار سے گرا تھا اور ڈانٹ اُسے پڑی تھی۔ اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اُس نے سوچا: غریب الیکشن جیتا تو پھر وہ اپنے مہمانوں کو خود ہی سنبھالا کریں گے۔

''اور کیا سنا ہے؟'' فیاں نے اپنی محویت سے باہر نکلنے کے بعد سوچا۔

''یہ سنا ہے کہ گاؤں ایک مٹھ ہے۔ باقی حال اوپر والا جانتا ہے۔'' اُس نے بھینس کو تھپکی دیتے اوپر دیکھتے ہوئے کہا۔ فیاض کو لگا کہ اُس نے اوپر کسی کو دیکھنے کی کوشش کرتے ہوئے معاملات وہاں ہی سپرد کر دیے ہیں۔ ''اب وہ بالٹی تو لاؤ۔'' فیاض ایک دم کِھل اُٹھا۔ بالٹی خالی تھی اور وہ ٹوٹتے ہوئے گلاس سے لے کر چھاتی میں بنتی ہوئی گھوکر سننے کے لیے الیکشن کو بھول گیا۔

فیاض نے ولٹوئی سر پر اُٹھائی اور بالٹی ہاتھ میں پکڑ کر پہلے دِن کی طرح ڈگمگاتا ہوا گھروں کی طرف چل پڑا۔ دودھ والا اُس کے انتظار میں تھا۔ وہاں معمول کی واردات ہوئی اور فیاض دودھ والے کے موٹر سائیکل کی رکھوالی میں کھڑا ہو گیا۔ دودھ والا واپس آ کے اُس کے پاس کچھ دیر رکا۔ اُس نے فیاض کو بھائی فقیر حسین کا پیغام دیا کہ آج یا کل رات اُسے ملے۔ فیاض کو ایک دم اپنے چہرے کا رنگ بدلتے ہوئے محسوس ہوا اور اُس نے اثبات میں سر ہلایا۔

پہلا دِن تھا کہ ڈیرے پر لوگوں کی آمد و رفت معمول کی نہیں تھی۔ گھر سے لسی، چائے اور کھانا لایا جا رہا تھا۔ یونین کونسل کے دیگر دیہات میں تعلق والوں کو پیغام بھیج کے بلوایا جا رہا تھا، بائیسکل، گھوڑی سوار اور پیادوں کے ذریعے پیغام رسائی ہو رہی تھی۔ دوسرے دیہات کے لوگ انھیں اُن کے اپنے گاؤں میں سر اُٹھاتے خطرے کے متعلق تنبیہ کرتے تو وہ قہقہے لگانا شروع کر دیتے کہ اُن کے پاس ہر اُٹھتے ہوئے سر کے لیے الگ ناپ کا جوتا ہے۔ یہاں سے بات مذاق میں بدل جاتی اور فیاض محسوس کرتا کہ دونوں کے ساتھی بھی شاید چاہتے ہیں کہ اُن کے دور کا اختتام ہو۔

اگلی رات فیاض بھائی فقیر حسین کے گھر گیا۔ بھائی فقیر حسین اُس کے ساتھ پہلے دِن سے بھی زیادہ اپنایت کے ساتھ ملا۔ بھائی فقیر حسین، فیاض کو معمول سے زیادہ خوش لگا؛ وہ اُسے دیکھے مسکرائے جا رہا تھا۔ وہ ابھی بیٹھے ہی تھے کہ بھائی فقیر حسین کی بیوی شربت لے کے آ گئی۔ اُس کو آتے دیکھ کے فیاض کو خیال آیا کہ اِس مرتبہ بھی وہ کچھ نوٹ اُس کی جیب میں ڈالے گی؟ ساتھ ہی اُسے پچھلے نوٹ یاد آ گئے۔ ماں نے ادھر اُدھر کی باتوں کے درمیان میں اُس سے ایک لاپرواہانہ انداز میں بتایا کہ اُس کے تکیئے کے پاس سو، سو کے دو نوٹ پڑے ہوئے تھے جو کسی فرشتے یا پری نے نہیں رکھے تھے۔ ماں اُسے پیغام دے رہی تھی کہ نوٹ چوری کے تھے۔ اُس نے لقمہ منہ میں ڈالتے ہوئے اُسے آدھا سچ بتانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اُس نے بتایا تھا کہ بھائی فقیر حسین نے روپے اُسے گھر کی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے دیے تھے کیوں کہ وہ ایک عرصہ دکان پر کام کرتا رہا ہے۔ ماں نا چاہتے ہوئے بھی مطمئن ہو گئی تھی۔

''تمھارے سرپرست ظالم لوگ ہیں۔'' بھائی فقیر حسین نے ایک جھٹکے کے ساتھ فیاض کو اُس کے خیالات کی دلدل سے نکالا۔ بھائی فقیر حسین سگریٹ کے دھوئیں کے اوپر سے اُسے دیکھ رہا تھا۔ فیاض نے ایک کھسیانی نظر کے ساتھ اُسے دیکھا۔ ''وہ گاؤں میں کسی کو خوش حال نہیں دیکھ سکتے۔ وہ کسی کی کسی بھی طرح کوئی مدد نہیں کرتے، وہ ہر کسی کو سر اُٹھانے کی اجازت نہیں دیتے......''

فیاض نے بات کاٹی:

''وہ کہتے ہیں کہ اُن کے پاس ہر سر کے لیے الگ ناپ کا جوتا ہے۔''

''یہ کہا اُنھوں نے؟'' اب بھائی فقیر حسین کی آواز میں نرماہٹ نہیں تھی۔ فیاض بھی خوف زدہ ہو گیا، اُسے ایک دم خیال آیا: کیا اُسے یہ بتانا چاہیے تھا؟ اُس نے سوچا کہ بھائی فقیر حسین کو ہر قسم کی صورتِ حال سے باخبر رکھنا منصوبے کا حصہ تھا۔ اُسے اِس خیال نے طاقت دی۔

''باہر کے لوگ اُنھیں اپنے گاؤں پر نظر رکھنے کو کہتے ہیں تو وہ دونوں اپنے جوتوں کے ناپ کی بات کرتے ہیں۔''

''ہمارے پاس بھی اُن کے میچ کا جوتا ہے۔ اُن کے مقابلے میں ایک کمہار کو لا رہے ہیں۔ وہ کمہار اُن سے امیر ہے۔ پچھلے بیس سالوں میں اُس نے اجناس کے کاروبار میں خوب دولت کمائی ہے۔'' بھائی فقیر حسین اب غصے میں نہیں تھا۔ ''میں نے تمھاری مالکی کی فرد نکلوالی ہے۔

تم اُن کے برابر کے حصے دار ہو۔ اُنھوں نے تمھاری تمام مالکی سنبھالی ہوئی ہے......" فیاض نے اُس کی بات کاٹنے کی کوشش کی تو بھائی فقیر حسین نے اُسے ہاتھ کے اشارے سے روکا، "ہم نے ابھی یہ مسئلہ کھڑا نہیں کرنا۔ میں کاروباری آدمی ہوں اور میں نے اِس پیشے میں کافی مار کھا کے بہت کچھ سیکھا ہے۔ اُن سبقوں میں ایک سبق ایک وقت میں ایک کام کرنا ہے۔ پہلے اُنھیں الیکشن میں ہرانا ہے اور پھر بعد میں تمھاری زمین سے بے دخل کرنا۔ یہ دونوں کام کرنے کے بعد تمھیں گاؤں کی چوہدراہٹ کی پگڑی پہنانی ہے۔" فیاض کو پہلے تو بھائی فقیر حسین کی بات کی سمجھ نا آئی اور جب وہ سمجھ گیا تو اُسے یقین نہ آیا۔ وہ خاموشی سے اِس خوب صورت گھر کو دیکھنے لگا جس کے صحن پر نظر نہیں ٹھہرتی تھی، اُس کا جی برآمدے کے سرخ رنگ کے پیل پایوں کو چھونے کو کر رہا تھا اور اُن پیل پایوں کے اوپر پڑے لینٹل سے گملے لٹکے ہوئے جن میں خوب صورت پتوں والے پودے لگے ہوئے تھے۔ "انھوں نے میرا کاروبار ختم کروانے کی بہت کوشش کی۔ اُنھیں خوف تھا کہ میں اپنے کاروبار کے سر پر گاؤں میں اِس قسم کا اثر و رسوخ بنالوں گا جس نے اُنھیں لے ڈوبنا ہے۔ اُنھوں نے میری دکان کے سامنے لوگ کھڑے کر دیے جو گاہکوں کو اندر آنے سے روکتے تھے۔ لوگ صرف مجھ سے ہی خریدنا چاہتے تھے لیکن اُنھوں نے ساتھ والے گاؤں کے ایک دکان دار کو زیادہ سودا رکھنے کا کہا ہوا تھا۔ لوگ اپنی ضروریات مجبوری کے تحت وہاں سے لاتے اور کچھ رات کو دروازہ کھٹکھٹا کر سامان خریدتے۔ منافع تو دور کی بات تھی میری راس بھی مر رہی تھی۔ اُنھوں نے میرے لیے جینے کے راستے آہستہ آہستہ بند کر دیے۔ مجھے صرف اپنے کاروبار کے ساتھ دلچسپی تھی جب کہ اُنھوں نے مجھے اپنا مخالف اور دشمن سمجھا۔ اپنی بقا کے لیے میں نے اُن کے سامنے کھڑے ہو جانے کا فیصلہ کر لیا۔" بھائی فقیر حسین اپنے ماضی سے نکل کے ہنسا۔ "تم جانتے ہو کہ تمھارے شریک بزدل ہیں۔ انھیں مرنے، پھسلن والی جگہ اور جھگڑے سے کافی خوف آتا ہے۔"
اب دونوں ہنسے۔ بھائی فقیر حسین نے ایک نیا سگریٹ سلگایا۔

"پھر آپ نے کیا کیا؟" فیاض کو محسوس ہوا کہ بات کسی اور طرف بھی نکل سکتی ہے۔ بھائی فقیر حسین کے متعلق مشہور تھا کہ وہ کبھی بات ختم نہیں کرتا اور ہمیشہ بولتا ہی جاتا ہے۔

"میں نے اُن کا سامنا کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ ایک دِن جب اُن کے ڈیرے میں کچھ مہمان آئے ہوئے تھے، میں ہاتھ میں ڈانگ اور ڈب میں پستول چھپائے ہوئے اُن کے ڈیرے

پر پہنچ گیا۔ میں دروازے کے باہر کھڑا ہوگیا اور جو میرے منہ میں آیا کہتا گیا اور اُنھیں چارپائیوں پر سے اُٹھ کر مجھے روکنے کا کہتا رہا۔ کوئی بھی مجھے روکنے یا منع کرنے نہیں آیا۔ اُنھیں تو سانپ سونگھ گیا تھا۔'' بھائی فقیر حسین شاید تھک گیا تھا؛ فیاض کو اُس کا سانس پھولا ہوا محسوس ہوا۔ اُس نے برآمدے کی طرف کسی کو اشارہ کرکے اپنی بات جاری رکھی، ''صبح میری دکان کے آگے کوئی سنتری نہیں تھے اور پہلے گاہک کو حیرانی ہوئی کہ کسی نے اُسے روکا نہیں۔ اُس کے بعد اُنھوں نے کبھی میرا نام نہیں لیا؛ ہمیشہ مجھے ہٹی والا ہی کہتے۔ وہ اپنے خیال میں میری بے عزتی کر رہے تھے جب کہ مجھے ہٹی والا کہہ کے میری ہٹی کی مشہوری کر رہے تھے۔'' بھائی فقیر حسین نے ایک لمبی سانس لی۔

فیاض کو اِن معاملوں کی اتنی سمجھ نہیں تھی اِس لیے وہ خاموش ہی باتیں سنتا رہا۔ وہ سمجھے بغیر بھائی فقیر حسین کی باتیں سنے چلا جانا چاہتا تھا۔ بھائی فقیر حسین اُسے گاؤں کا سربراہ بنانا چاہتا تھا تو سربراہی پگڑی سر پر رکھ کے وہ بھی اُن دونوں کی طرح چارپائی پر لیٹ جائے گا اور وہیں سے ہر کسی کے لیے ایسی زبان استعمال کیا کرے گا جو کوئی بھی شریف انسان استعمال نہیں کرتا۔ ''بھائی فقیر حسین! لوگ اُن کے خلاف ووٹ دے دیں گے؟'' فیاض نے کوئی بات کرنا ضروری جانا اور اُسے یہ شک بھی تھا کہ لوگ اُن سے اتنا خائف تھے کہ ممکن ہے بھائی فقیر حسین کے اُمیدوار کو ووٹ ہی نا دیں۔ اگر لوگوں نے اُن دونوں کو ووٹ دے دیے تو بھائی فقیر حسین کا خواب کبھی پورا نہیں ہوگا۔ وہ چاہتا تھا کہ بھائی فقیر حسین کامیاب ہو، اُسے سر پر سربراہی کی پگڑی رکھوانے کا کوئی شوق نہیں تھا۔

''میں کچی گولیاں نہیں کھیلا ہوں۔ جس بھی برادری کے ساتھ میرے لوگ معاملہ طے کرتے ہیں وہ بعد میں اُنھیں مسجد میں لے جا کے اُن سے حلف لیتے ہیں کہ وہ اپنے کیے عہد سے پھریں گے نہیں۔ میں اِسے ویلڈ کرنا کہتا ہوں۔ میں گاؤں کی اکثریت کو ویلڈ کر چکا ہوں اور وہ سب یہاں ہیں۔'' بھائی فقیر حسین نے اپنی مٹھی بند کرتے ہوئے اُسے دکھائی۔ ''تم فکر مت کرو تمھارے سر پر پگڑی پکی۔'' بھائی فقیر حسین ایک بلند قہقہہ لگا کر ہنسا۔ فیاض کو اُس کے ہنسنے سے کچھ شرمندگی بھی ہوئی اور اپنی شرمندگی دور کرنے کے لیے وہ بھی ہنسی میں شامل ہوگیا۔ اُسی وقت بھائی فقیر حسین کی بیوی کھانا لے آئی۔ فیاض نے کریلے گوشت پیٹ بھر کے کھائے اور بعد میں

ٹھنڈی کچی لسی پی۔

وہ جب گھر گیا تو ماں چھت پر لیٹی اُس کے انتظار میں تھی۔ وہ خاموشی سے اپنی چار پائی پر لیٹ گیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ ماں اُس سے پوچھے کہ وہ کہاں سے آیا ہے؟ اُس نے ظاہر کیا کہ وہ لیٹتے ہی سو گیا ہے اور ماں کے دوسری طرف منہ کر لیا۔ ''بیٹا، ایک بات بتاؤ؟'' ماں نے سرگوشی کی۔ فیاض کو ماں کی سرگوشی میں ایک خوف نظر آیا۔ اُسے محسوس ہوا کہ ماں کے ساتھ کسی نے گستاخی کی ہے! اگر ایسا ہوا ہو تو کیا وہ بدلہ لے سکے گا؟ کیا اُن دونوں کو وہ سنا سکے گا جو بھائی فقیر حسین نے سنائیں تھیں؟ اُسے احساس ہوا کہ ایسا ممکن نہیں۔ اگر ایسا ممکن نہیں تو وہ ماں کی بات کیوں سنے؟ اُس نے ہلکا سا ایک خراٹا لیا۔ ''تیرا باپ بھی ایسے ہی کیا کرتا تھا۔'' ماں نے دھیمے سے ہنستے ہوئے سرگوشی کی اور یہ سنتے ہی فیاض کی ہنسی چھوٹ گئی۔ دیر تک ماں بیٹا دبی دبی ہنسی ہنستے رہے۔ ''سنا ہے کہ گاؤں والے ہمارے رشتے داروں کا مقابلہ کرنا چاہتے ہیں؟'' وہ رکی۔ اُسے شاید فیاض کے جواب کا انتظار تھا۔ وہ خاموش لیٹا رہا۔ ''اگر ہمارے رشتے دار ہار گئے تو کیا بنے گا؟'' ماں کی آواز میں کپکپی تھی۔ فیاض کو اُس کپکپی میں خوف اور خوشی دونوں ہی ملے ہوئے محسوس ہوئے۔ ''تم باہر رہتے ہو، تمھارا کیا خیال ہے؟ تم لوگوں کی باتیں سنتے رہتے ہو۔ اُن کی بیویاں کہتی رہتی ہیں کہ تمھیں باتیں سننے کا شوق نہیں لگتا۔ یہ اچھی بات ہے لیکن پھر بھی تم نے کچھ تو سنا ہوگا؟'' ماں نے پھر پوچھا۔ اب فیاض کو اپنی ماں کی آواز میں کپکپی یا خوف یا خوشی کے بجائے تجسس محسوس ہوا۔

''ماں! تمھیں یہ کس نے بتایا؟'' فیاض نے جواب دینے کے بجائے سوال پوچھنا ضروری سمجھا۔

''دونوں کی بیویاں بات کر رہی تھیں۔ میں کون سا باہر نکلتی ہوں بیٹا۔'' ماں نے ایک سرد آہ کھینچتے ہوئے کہا۔

''سچی بات یہ ہے ماں کہ مجھے کسی بات کا علم نہیں۔ میرا ابھی ووٹ بنا ہی نہیں اور تو جہاں چاہے ووٹ ڈال دینا۔'' ماں نے پھر ایک لمبی سانس کھینچی۔ اُسے پھر اپنے خاوند کو یاد کرنا مناسب نہیں لگا۔ اُس نے اپنے خاوند کی زندگی کے بارے میں کئی ایسی دل چسپ اور غیر دل چسپ باتیں سن رکھی تھیں۔

''اچھی بات ہے بیٹا۔ خود کو کسی بکھیڑے میں نا ڈالنا جس طرح تیرے بڑے کرتے آئے ہیں۔'' ماں نے پھر ایک لمبی سانس بھری اور کروٹ لے کے ہلکے ہلکے خراٹے لینے لگی۔ فیاض کچھ نا کچھ سوچے چلے جانا چاہتا تھا؛ کیا سوچے؟ اُسے سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ کیا وہ الیکشن کے بارے میں سوچے؟ وہ چاہتا تھا کہ دونوں کو الیکشن میں اتنی بڑی شکست ہو کہ مارے شرمندگی کے دونوں کے پیٹ سکڑ جائیں۔ اگر وہ ہار گئے تو گاؤں میں جشن منایا جائے گا۔ کیا وہ بھی اُس جشن میں شریک ہو گا یا ڈیرے میں اُن کی شکست کے بعد کی مایوسی میں اُن کا ساجھی ہو گا؟ وہ کہیں بھی نہیں جائے گا اور گھر آ کے ماں کے پاس بیٹھے گا اور اُس کے ساتھ مستقبل کی منصوبہ بندی کرے گا۔

وہ ابھی جاگ ہی رہا تھا کہ آسمان بادلوں سے بھر گیا اور ہوا میں ایسی خنکی آ گئی جو اُس کے جاگتے رہنے کے خواب کو چکنا چور کر کے اُسے نیند میں لے گئی جسے بارش کے پہلے قطرے نے ختم کیا۔ فیاض نے ماں کی طرف دیکھا، وہ ابھی تک سو رہی تھی۔ اُس نے مسکراتے ہوئے سوچا کہ شاید ماں پر ابھی تک کوئی قطرہ نا ہی گرا ہو! اور اُسی وقت ماں نے پہلے آسمان کی طرف اور پھر اُسے دیکھا۔ ''تھوڑا انتظار۔ شاید نا ہی آئے۔'' فیاض بھی چاہتا تھا کہ نا ہی آئے کیوں کہ اُن کا واحد کمرہ خستگی کا نمونہ تھا۔ لیکن ایسے ہوا نہیں اور بوچھار نے اُنھیں وہیں آ لیا اور وہ بھیگتے ہوئے نیچے اپنے کمرے میں پہنچے۔ بارش تیز تھی، اتنی تیز کہ فوراً ہی پرنالوں میں سے پانی بہنے لگا، بارش کی موسیقی اور پرنالوں کا شور ایک دوسرے میں شامل ہو کے ایک ہی بن گئے اور ساتھ ہی چھت کئی جگہوں سے ٹپکنے لگی۔ کمرے میں پانی جمع ہونا شروع گیا جسے فیاض ایک دیگچی سے باہر پھینکتا رہا۔ یہ تھکا دینے والا کام تھا لیکن کرنا بھی ضروری تھا۔ وہ پانی نکالتا رہا، باہر بارش برستی رہی اور چھت ٹپکتی رہی۔ جب وہ تمام پانی نکال چکا تو بارش بھی تھم چکی تھی اور اُسے اپنی کمر سیدھا رکھنا مشکل لگ رہا تھا۔ وہ تھکاوٹ سے چور اپنی ڈھیلی چارپائی پر لیٹا تو اُس نے عہد کیا کہ وہ اپنے حصے والی جگہ پر ایسا گھر بنائے گا جس کی چھت نا ٹپکے۔

صبح معمول کا دن تھا۔ وہ حویلی پہنچا تو بھینسیں بارش سے اکٹھے ہونے والے پانی میں لیٹی ہوئی تھیں اور جب اُنھیں اُٹھایا گیا تو اُن کے بدنوں سے گوبر ملا پانی ٹپک رہا تھا۔ دودھ نکالنے والے کی ہچکچاہٹ قدرتی تھی لیکن اُسے دودھ نکالنا ہی تھا۔ انھوں نے بھینسوں کے جسم خشک ہونے کا انتظار کیا اور جب دودھ گھر پہنچ گیا اور دودھ والا اپنا موٹر سائیکل لے گیا تو وہ ڈیرے پر

پہنچا جہاں لوگوں کا جم گھٹا تھا۔ برآمدے میں حقے اور سگریٹوں کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی اور دبی دبی باتیں ہو رہی تھیں۔ فیاض کو وہاں ایک کھچاؤ کا احساس ہوا۔ اُس دِن وہ دونوں بیٹھے ہوئے تھے اور مسلسل باتیں کیے جا رہے تھے۔ وہ کچھ فاصلے پر بیٹھا تھا اِس لیے اُن کی باتیں نہیں سن سکتا تھا۔ اگلے دِن نامزدگی کے کاغذات جمع ہونے تھے اور اُنھوں نے اپنے اُمیدوار کا اعلان کرنا تھا۔ وہاں وہی لوگ اکٹھے تھے جن کا روز آنا ہوتا تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جو دِن میں کسی نا کسی وقت اُن کے غصے کا بوجھ سہتے لیکن اُن کی مسکراہٹ ہمیشہ قائم رہتی۔ فیاض کو محسوس ہو رہا تھا کہ دونوں آج اُن لوگوں سے اپنایت سے بات کر رہے تھے۔ اُسے حیرت تھی کہ وہ دونوں اِن لوگوں کو کبھی اپنے برابر کا نہیں سمجھا کرتے تھے لیکن آج اُن سے ایسے باتیں کر رہے تھے کہ ہمیشہ سے ہی اُن کے ہمدرد اور غمگسار رہے ہوں۔ ڈیرے پر ایک نا اُمیدی کی سی فضا تھی جسے وہ دونوں اُمید میں تبدیل کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ فیاض کو اِس سارے ماحول میں کچھ عجیب سا لگا۔ اُسے محسوس ہوا کہ یہاں موجود سب لوگ ایک دوسرے کو دھوکہ دے رہے ہیں۔ اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی کہ وہ خود بھی اُس دھوکے کا حصہ تھا۔ تبھی گولے خاں نے ہاتھ اُٹھا کے سب کو خاموش کروایا۔ ''اِس گاؤں سے کونسلر ہمیشہ بلا مقابلہ ہوتا آیا ہے اور اب ایک کمہار گاؤں کے مقابلے میں آ گیا ہے۔ کل اُسے کاغذات جمع کروانے نہیں جانے دیا جائے گا اور جو بھی اُس کا تصدیق کنندہ وغیرہ ہوگا اُسے بھی گاؤں کا حصہ بننے کا کوئی حق نہیں۔'' سب خاموش اُسے دیکھتے جاتے تھے۔ کسی نے کوئی حمایت یا مخالفت نہیں کی۔ فیاض، بھائی فقیر حسین کو اطلاع دینے کے لیے ہر بات پر غور کر رہا تھا اور ہر چہرے کو پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اگر کمہار کو صبح گاؤں سے نکلنے سے روکا جانا ہے تو یہ خبر بھائی فقیر حسین تک رات کو پہنچائی جانی چاہیے۔ ''گاؤں کا سرکاری اُمیدوار ہمیشہ کی طرح چودھری مختار خاں ہے۔ صبح ایک ویگن یہاں موجود ہوگی اور اُس میں سب کاغذات جمع کروانے جائیں گے یعنی ہر گھر کا ایک نمائندہ۔'' وہاں کئی پیروں کے گھسیٹے جانے، کھانسنے اور حقے کے لمبے کشوں کی آوازیں آئیں۔ ''ہم سب مل کے جائیں گے۔ جو جائے وہ اپنے پٹھے دتھے کا بندوبست کر لے اور واپسی پر میرے پاس مانگنے نا آئے، مجھے خود بھی ضرورت ہے۔'' کسی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ شاید یہ ہر بار ہوتا ہو! فیاض کو ماحول کے کھچاؤ میں اضافہ ہوتے لگا۔ کیا لوگ جانا نہیں

چاہتے تھے یا اُنھیں دل چسپی ہی نہیں تھی؟

گولے خاں مختصر سی تقریر کے بعد بیٹھ گیا۔ اُس نے حقے کا کش لیتے ہوئے موجود لوگوں کو غور سے دیکھا اور پھر اُس نے مختار کی طرف دیکھا۔ ''کمہار کو اطلاع تو ہو گئی ہوگی کہ اُس کا کھوٹھپا جا رہا ہے۔ بہت پیسہ کما چکا۔ جس طرح جونک کا چوسا ہوا خون نکال کر اُسے واپس پوٹے جتنی بدصورت سی مخلوق بنا دیا جاتا ہے اب وہی حال کمہار کا کرنا ہے۔ برسوں کی ٹھگی ہوئی دولت اُس کے اندر سے نکال کر اُسے پھر کھوتے پر بٹھا دینا ہے۔'' سب چہروں پر مختلف تاثرات والی مسکراہٹیں پھیل گئیں۔ فیاض کو کسی بھی مسکراہٹ میں خوشی نظر نہیں آئی۔ اُسے کمہار کی شکل یاد آ گئی اور خون چوس کر پھولی ہوئی جونک بھی: دونوں اُسے ایک جیسے ہی لگے۔

وہاں دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ اُس جم گھٹے میں چند لوگ دونوں کے حمایتی بھی تھے جو اُنھیں مشورے دیتے رہے اور کمہار کو روکنے کے طریقوں پر بھی غور کرتے رہے۔ کئی منصوبوں میں سے یہ بھی ایک منصوبہ تھا کہ اُسے چوری کا گدھا رکھنے پر پھنسا دیا جائے، بعد میں بے شک یہ الزام غلط ہی ثابت ہو جائے لیکن کام تو بن جائے گا۔ اِس منصوبے میں بھی کسی کو جان نظر نہیں آئی کیوں کہ کمہار اب کئی سالوں سے جنس اپنے ٹریکٹروں پر ڈھو رہا تھا۔ اکثریت خاموشی سے باتیں سنے جا رہی تھی اور وہ آپس میں بھی کوئی بات چیت نہیں کر رہے تھے۔ فیاض کو یہ محسوس ہوا کہ خاموش ہونے کے باوجود وہاں موجود لوگوں کے بیچ کوئی بات ہو رہی تھی جس کی زبان اُس کی سمجھ سے باہر تھی۔ فیاض کو وہ دونوں مطمئن نظر آئے جس سے اُسے بھی اطمینان ہوا۔ جس طرح کی بات بھائی فقیر حسین نے اُس کے ساتھ کی تھی اُس کے مطابق گاؤں کی اکثریت ویلڈ ہو چکی تھی اور وہاں آنے والوں کا وہاں آنا اُن کی مجبوری تھی اِس لیے دونوں کا مطمئن ہونا بے معنی تھا۔

وہ رات کو سیدھا بھائی فقیر حسین کے گھر چلا گیا۔ صحن میں چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں اور سب سونے کی تیاری میں تھے۔ فیاض کو مایوسی بھی ہوئی کہ اُسے کھانا نہیں ملے گا۔ بھائی فقیر حسین اور وہ صحن کے کونے میں کرسیوں پر بیٹھ گئے اور تھوڑی دیر کے بعد دال اور چپڑی ہوئی روٹیاں آ گئیں۔ کھاتے ہوئے فیاض نے ڈیرے پر ہوئی تمام کارروائی تفصیل سے سنائی۔ وہ پوری شام مکمل کارروائی یاد کرنے کی کوشش کرتا رہا اور مسلسل بھول جاتا رہا لیکن اب جو بتانے لگا تو اُسے سب کچھ یاد تھا۔ بھائی فقیر حسین نے اُس کی تمام پریشانیاں دور کر دیں۔ کمہار کو پہلے ہی شہر بھیج

دیا گیا تھا اور اُس کے تصدیق کرنے والے بھی ساتھ تھے۔ جب یہاں سے جانے والوں کی ویگن وہاں پہنچی ہے تو وہ اپنے کاغذات تیار کروا چکے ہوں گے۔ یہ لوگ ایک افراتفری میں اپنی کارروائی کر رہے ہیں جب کہ کمہار کا سب کام آج رات مکمل ہو جانا تھا۔ کاغذات کے جمع کرنے کے وقت اُس کے ساتھ چند حمایتیوں کے علاوہ کچہری کا ہر بڑا وکیل ہوگا۔ ''تم ابھی چھوٹے ہو لیکن تم اُس سؤل کی طرح ہو جس کا منہ تیز ہوتا ہے۔ وہ ہمیں کچھ نہیں دیں گے اور ہم نے بھی اُن کے پاس کچھ نہیں چھوڑنا۔ چھیننا ہو گا سب کچھ؛ اُن موٹے پیٹوں میں سے نکالنا ہو گا۔ تم ابھی تک اطاعت گزار ہو، اب تمھیں سرکشی اور مدافعت کرنی پڑنی ہے۔ میں اب امیر آدمی ہوں اور یہ میری سرکشی اور مدافعت کی وجہ سے ہے۔ تمھیں مناسب وقت پر بغاوت کرنی ہوگی۔'' فیاض اُس کی ہر بات غور سے سُن رہا تھا۔ اُس نے کبھی ایسی باتیں سنی نہیں تھیں۔ ماں ہمیشہ ہر قسم کے تنازعہ سے دور رہنے کی تلقین کرتی رہتی تھی اور وہ اتنا اطاعت گزار ہو گیا تھا کہ اُس کے اندر بغاوت کی چنگاری جو اُس کے خاندان میں دو نسلوں سے جلتی رہی تھی، اب بجھنے لگی تھی۔ بھائی فقیر حسین نے اُس کے اندر ایک شعلہ روشن کر دیا تھا جس نے اُس کے اندھیروں کو منور کرنا شروع کر دیا تھا۔

فیاض کاغذاتِ نامزدگی جمع کروانے والوں کے ساتھ شہر جانا چاہتا تھا۔ وہ اُن دونوں کی شکست کی کارروائی کے آغاز میں شامل ہونا چاہتا تھا لیکن بھائی فقیر حسین نے اُسے روک دیا۔ ''ہر کہانی کا ایک آغاز ہوتا ہے اور اُس کے اندر کچھ لوگ ہوتے ہیں جو کہانی کو بناتے ہیں۔ اُن لوگوں کا اُس کہانی میں اپنا اپنا حصہ ہوتا ہے۔ یہ بھی ایک کہانی ہے جس میں تمھارا حصہ ابھی سامنے آنا نہیں ہے۔ میں بھی نہیں جا رہا۔ میرا حصہ ابھی پیچھے رہ کر اُن کے راستوں میں رکاوٹیں کھڑی کرنا ہے۔ پھر میں سامنے آؤں گا اور آخری وار تم کرو گے۔''

''جیسے آپ کہیں۔'' پھر فیاض ہنسا۔ ''مجھے آپ کی کتاب اکثر یاد آتی ہے۔'' بھائی فقیر حسین نے کتاب کے ذکر پر ایک دم برآمدے کی طرف دیکھا جہاں اُس کی بیوی بیٹھی ہوئی تھی۔ اُس کے ہونٹوں پر ایک شریری مسکراہٹ پھیل گئی۔

''صبح آ جانا۔ اُن سب نے تو شہر ہونا ہے، ہم بات چیت بھی کرتے رہیں گے۔'' فیاض نے ایک عرصے کے بعد اپنے آپ کو ہلکا پھلکا محسوس کیا۔ اُسے لگا کہ اُس کے ڈیرے جانے سے پہلے والے دن لوٹ آئیں ہیں اور وہ کل بھائی فقیر حسین کو اپنی کتاب میں سے عورتوں کی

خاصیتیں پڑھتے ہوئے سنے گا۔ وہ جب گھر پہنچا تو ماں اُس کے انتظار میں تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ ماں سوئی ہوئی ہو۔ اُس کا جی باتیں کرنے کو نہیں کر رہا تھا۔

''ساتھ والی بتا رہی تھیں کہ ڈیرے پر حالات اچھے نہیں ہیں۔ اُن کو شک ہے کہ ہار جائیں گے۔'' ماں نے سرگوشی کی۔ فیاض کے جسم میں خوشی کی پھول جھڑیاں چھوٹنے لگیں لیکن اُس نے ماں کو کوئی جواب نہیں دیا۔ ''جب کوئی طاقت والا شکست کھاتا ہے تو قربان کرنے کے لیے جانور ڈھونڈتا ہے۔ تم اِس کھیل میں کہیں بھی نظر نا آنا۔ ہم پہلے ہی بہت قربانی دے چکے ہیں۔'' اُسے بھائی فقیر حسین کی بات یاد آ گئی کہ کہانی میں کام کرنے والوں کا اپنا اپنا حصہ ہوتا ہے اور اُس کا کہانی میں داخل ہونے کا ابھی وقت نہیں آیا تھا۔ وہ کہنا چاہتا تھا کہ اگر اُنھیں شکست کا خوف ہے تو وہ الیکشن میں حصہ ہی نا لیں لیکن اُس نے خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا۔ ماں جلد ہی سو گئی اور اُس کے معمول کے ہلکے ہلکے خراٹے چلنے لگے جو ہمیشہ کی طرح رات کا حصہ تھے۔ اُسے پھر نیند نہیں آ رہی تھی اور اُس نے سوچا کہ کل بھائی فقیر حسین کی کتاب تو سُننی تھی اِس لیے وہ نیچے والی لڑکیوں کو دیکھ کے اُن کی خصوصیات ایک بار پھر یاد کر لے۔ وہ آہستہ سے اُٹھا اور دبے پاؤں چلتا ہوا بنیرے تک پہنچا۔ اُس نے نیچے دیکھا تو لڑکیاں صحن میں مصروف تھیں۔ اُس کی نظر چوڑے منہ والی لڑکی پر تھی جو کچھ چھپاتی نہیں تھی۔ وہ پوچھنا چاہتا تھا کہ کیا اُس کے پاس کوئی ایسی بات ہے جو اُس نے چھپا کے رکھی ہو کیوں کہ کتاب کے مطابق وہ کچھ بھی اپنے پاس نہیں رکھتی۔ وہ اُنھیں صحن میں اپنے کام کرتے ہوئے دیکھتا رہا اور اپنے خیالوں میں گم وہیں سو گیا۔ اُسے احساس ہوا کہ اُسے کہیں دور سے پکارا جا رہا ہے۔ وہ جلدی سے اُٹھا اور اردگرد دیکھا۔ ماں اپنی چارپائی بیٹھی ہوئی تھی اور فیاض کو تسلی ہوئی کہ اُس کا منہ دوسری طرف تھا اور وہ اُسے بلا رہی تھی۔ فیاض جتنا ممکن تھا اُتنی ہی آہستگی کے ساتھ اُٹھا اور چارپائی پر بیٹھ گیا۔ چارپائی نے اُس کے ہلکے سے بوجھ تلے بھی آہ بھری اور ماں اُس کی طرف پلٹی۔ ''سونے سے پہلے سب کچھ کر کے آتے ہیں۔ کوئی بات ہے کہ چھتوں کو پلیت کرتے پھرو۔'' پھر وہ تھوڑا سا ہنسی اور لیٹتے ہی خراٹے لینے لگی۔

صبح جب وہ حویلی گیا تو ویگن آ چکی تھی اور وہ دونوں بھی کلف لگے کرتوں، تہہ بندوں اور کالے جوتوں میں اپنی اپنی چارپائیوں پر بیٹھے ہوئے تھے اور لوگوں کو گھروں سے نکالنے کے لیے اُن کے حاشیہ بردار گھیر گھار کے اکٹھا کر رہے تھے۔ جب فیاض دودھ نکلوا رہا تھا تو ویگن روانہ

ہوگئی۔ اُس میں اُتنے ہی لوگ تھے جتنوں کو وہ ہانک کے گھروں سے نکال سکے تھے۔ اکثریت کی بیویوں نے بتایا کہ وہ پٹھا دَتھا کرنے نکل گئے ہیں کیوں کہ شہر میں پورا دِن لگ جاتا تھا۔ ڈیرے والے کچھ دیر انتظار کریں کہ وہ فارغ ہو کے پہنچ جائیں گے۔ دونوں کو اطلاع مل چکی تھی کی کمہار رات کا شہر میں ہی ہے اِس لیے وہ وہاں اب جلد از جلد پہنچنا چاہتے تھے۔ دودھ والا جب اپنا موٹر سائیکل لے گیا تو فیاض سیدھا بھائی فقیر حسین کی دکان پر پہنچا تو بھائی فقیر حسین اُس وقت دکان کھول کے صفائی کر رہا تھا۔ ''آپ شہر کیوں نہیں گئے؟'' فیاض نے پوچھا۔ اُسے بھائی فقیر حسین ایک پراسرار قسم کا آدمی لگنے لگا تھا۔ وہ اپنے کام کا کبھی نقصان نہیں ہونے دیتا تھا، نہایت دل چسپی کے ساتھ اُسے عورتوں کے خصائص کی کتاب مزے لے کے پڑھ کر سناتا، گاؤں کے حالات پر نظر رکھتا اور موٹوں دونوں کے ساتھ اپنی دشمنی بھی پوری رکھتا۔

''میرا جانا ضروری نہیں تھا۔ سب کچھ طے ہو چکا ہے۔ تم جانتے ہو کہ میں یہاں سے ناغہ نہیں کر سکتا۔'' بھائی فقیر حسین نے جواب دیا۔ ''شاویلا کھا چکے ہو؟''

''نہیں۔ حویلی سے سیدھا آپ کے پاس آ گیا ہوں۔'' اُس نے جھجکتے ہوئے جواب دیا۔ اُسے محسوس ہوا کہ رات کو وہ بھائی فقیر حسین کو ایک بڑے منصوبے کے تحت ملنے جاتا تھا: اِس وقت تو آنے کا مقصد صرف دِن گزارنا تھا۔

''گھر بتا آؤ۔ جو بھی کھانا ہو میرے لیے بھی کہہ آنا۔'' فیاض کچھ سوچتے ہوئے اُٹھا۔ اُسے بھائی فقیر حسین کی بیوی سے کچھ جھجک تھی اور کچھ گھبراہٹ بھی۔ اُسے اُس کے ساتھ بات کرنا عجیب لگ رہا تھا۔ وہ جب گھر گیا تو وہاں ہر چیز اُسے سلیقے سے لگی جیسے رات کو ہوتی تھی۔ یہ وہ وقت تھا جب گھروں میں ہر چیز بے ترتیب ہوتی ہے۔ اُس کے اپنے احاطے میں اِس وقت کچھ بھی سلیقے سے نہیں ہوتا؛ اُن دونوں کی بیویاں بے ترتیب بالوں کے ساتھ، کچھ کیے بغیر، اِدھر اُدھر پھر رہی ہوتی تھیں۔ اُنھیں شاید گھر میں کسی قسم کی سجاوٹ یا آراستگی کا پتا ہی نہیں تھا۔ بھائی فقیر حسین کے گھر میں صحن کو جھاڑو لگا دیا گیا تھا، صحن میں سے چار پائیاں اُٹھا دی گئی تھیں اور گملوں کو نا صرف پانی دیا گیا تھا، پتے بھی دھو دیے گئے تھے۔ بھائی فقیر حسین کی بیوی اُسے دیکھ کے اپنایت سے مسکرائی، فیاض اُسے دیکھ کے شرمایا اور اُس کے شرمانے پر بھائی فقیر حسین کی بیوی نے قہقہہ لگایا۔

''ہم دونوں کے لیے کھانے کو کچھ بھیج دیں۔'' فیاض کے لہجے میں گھبراہٹ کی لکنت

تھی۔ اُسے بھائی فقیر حسین پر غصہ بھی آیا کہ اُس کو گھر بھیجنے کے لیے کیا کوئی اور نہیں ملا؟ وہ ٹیلی فون بھی کر سکتا تھا۔ وہ کوئی مزید بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اُس سے شاید کوئی فقرہ ہی نا ادا ہو۔ وہ پہلے ہی موقع پر وہاں سے کھسک جانا چاہتا تھا۔

''تمھارا اپنا گھر ہے۔ گھبرانے کی ضرورت نہیں۔'' اب وہ اُس کے پاس کھڑی تھی؛ اتنی پاس کہ وہ اُس کے بدن سے صابن، سرسوں کے تیل اور پسینے کی بو محسوس کر سکتا تھا۔ اُسے بدن سے اُٹھتی ہوئی پسینے کی بو میں بسی صابن اور سرسوں کے تیل کی خوشبو نے مستی کے ہلکورے دیے۔ اُس نے فوراً اپنے ذہن کو اِن خیالات سے آزاد کیا۔ اب وہ اپنے آپ ہی مسکرا دیا۔

''کبھی کبھار آ جایا کرو۔'' بھائی فقیر حسین کی بیوی نے اُس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ وہ کچھ دیر ہاتھ کو وہیں رکھے کھڑی رہی اور پھر انگلیاں اُس کے کان کی لوؤں کو ہلکے سے چھو کر وہیں ہی رکی رہیں اور پھر اُس کے گال پر آ گئیں۔ فیاض کو لگا کہ وہ کوئی خواب دیکھ رہا تھا۔ پھر بھائی فقیر حسین کی بیوی نے ہنستے ہوئے اُس کے گال پر ایک ہلکی سی چٹکی کاٹی جس کے جواب میں وہ کھسیانا سا ہنس پڑا۔ ''اور پھر کسی دِن بغیر کسی کام کے آؤ اور ہم کمرے میں بیٹھ کے باتیں کریں گے۔'' فیاض کو یہ عجیب لگا۔ اُسے محسوس ہوا کہ اُس کی کوئی قیمتی چیز اُس سے زبردستی چھین لی گئی ہے۔ بھائی فقیر حسین کی بیوی نے ایک لمبی سانس لی۔ فیاض نے چونک کے اُس کی طرف دیکھا۔ چند ملاقاتوں میں فیاض نے اُس کی شکل نہیں دیکھی تھی۔ اُن کا جب بھی آمنا سامنا ہوا، اُس نے اپنی نظر ہمیشہ جھکائے رکھی تھی۔ آج پہلی مرتبہ اُس نے بھائی فقیر حسین کی بیوی کو غور سے دیکھا۔ اُس کا رنگ سفید، گال بیضوی اور ٹھوڑی چہرے کی مناسبت سے تھوڑی چوڑی تھی جو اُسے اچھی بھی لگی۔ اُس نے سوچا کہ وہ چند عورتوں کی شکلوں کے بارے میں پڑھوائے گا جن میں بھائی فقیر حسین کی بیوی بھی شامل ہوگی۔

''آپ کو اُس کتاب سے اتنی دل چسپی کیوں ہے؟'' فیاض کو اپنے سوال پر حیرت بھی ہوئی۔ اُس نے یہ سوال پوچھتے ہوئے دروازے کے اوپر رکھنے میں رکھی ہوئی کتاب کی طرف اشارہ کیا تھا اور اشارہ کرتے ہاتھ کے نیچے آنے سے پہلے ہی وہ خوف زدہ بھی ہو گیا۔ وہ جانتا تھا کہ بھائی فقیر حسین ایک سخت مزاج آدمی ہے اور عین ممکن تھا کہ وہ اُسے چلتا کرتا اور اُن دونوں کے ساتھ مل کے جائیداد اُس کے ہاتھ نا لگنے دیتا۔ وہ جلد بازی میں کہی گئی بات کے بعد اب بھائی

فقیر حسین کے جواب کا منتظر تھا اور دکان میں شاید دیر تک خاموشی رہتی کہ درمیانی عمر کی ایک عورت خریدداری کے لیے آ گئی۔ وہ جیسے ہی گئی تو بھائی فقیر حسین نے ایک قہقہہ لگایا۔ فیاض کو یہ قہقہے بہت پسند تھے؛ شاید اِس لیے کہ ایسے قہقہوں کا اُس کی زندگی میں کہیں بھی گزر نہیں تھا۔ اُس نے ہنستے ہوئے رکھنے میں پڑی کتاب کی طرف دیکھا اور پھر فیاض کو دیکھنے لگ پڑا۔

''مجھے اِس کتاب کے ساتھ ایک طرح سے عشق ہے۔'' اب بھائی فقیر حسین سنجیدہ تھا۔ ''تم میری بات کو سمجھو گے نہیں لیکن میں تمھیں بتاؤں گا ضرور۔ میں اِس کتاب کو پڑھتے ہوئے بچہ بن جاتا ہوں۔ تمھیں معلوم نہیں کہ میں کبھی بچہ تھا ہی نہیں۔ میرا باپ ایک غریب آدمی تھا؛ اتنا غریب کہ جتنا گاؤں میں اُن کے ڈیرے پر آنے والے لوگ۔ غربت کا ہمارے گھر میں بسیرا تھا اور وہی غربت میرے اندر آج بھی زندہ ہے۔ میں اِسے قتل کرنے کی کوشش کرتا ہوں لیکن میرا پیسہ ابھی اتنا مضبوط ہتھیار نہیں بن سکا کہ اُسے جان سے مار دے۔ میں آج بھی اُسے اپنے پیٹ کے ساتھ ایک کمر بند کی طرح باندھے پھرتا ہوں۔ میں ابھی بچہ ہی تھا جب میرے باپ نے مجھے ہماری غربت کا احساس دلایا اور میں اُسی دِن بچے سے اُتنی عمر کا ہو گیا جتنی میری آج ہے یا کسی کل کو ہو گی۔ میں نے بچوں والے کھیل نہیں کھیلے، اُن کی شرارتیں نہیں کیں اور نا ہی اُن جیسی معصومیت میرے حصے میں آئی۔ میں بس بڑھ پختہ ہو گیا۔ باپ نے جہاں مجھے آغازِ جوانی میں سے گزارے بغیر جوان کر دیا، وہاں اُس نے مجھے دس جماعت بھی پاس کرائی۔

''ہم نے یہ دکان کھول لی۔ دکان میں سودا برائے نام تھا لیکن ہم اِسے زیادہ کرتے گئے۔ اِس عمل میں تھوک والوں کے پیسے بھی مارے اور قیمتیں بھی دگنی اور تگنی رکھیں۔ کچھ ایسے بھی ہوا کہ گاؤں میں کوئی اور دکان نہیں تھی اور جب دوسری دکانیں کھلیں تو تب تک یہ دکان مقابلے کے لیے تیار تھی۔ اسی جنگ میں کہیں سے کتاب میرے ہاتھ لگ گئی اور یہ ہی میرے بچپن کی شرارت بن گئی اور جوانی کا اُبال بھی۔'' فیاض ایک حیرت میں گم بھائی فقیر حسین کو دیکھتا جاتا تھا۔ کچھ باتوں نے اُسے اپنے حصار میں لے لیا اور کچھ اُس کی سمجھ میں ہی نا آئیں۔ وہ بس ایک غنودگی، بوکھلاہٹ اور انتہائی ارتکاز کے ساتھ اُس کی باتوں میں محو تھا۔ بھائی فقیر حسین کے لہجے کی یکسانیت بعض اوقات اُسے اُکتاہٹ کا شکار بھی کر دیتی لیکن پھر بھی وہ اُس کی باتیں سنے چلے جا رہا تھا۔ ''اب یہ کتاب مجھے اُس وقت میں لے جاتی جس میں میں گیا ہی نہیں۔ میرا شادی سے پہلے کسی عورت کے ساتھ

تعلق نہیں رہا تھا لیکن اِس کتاب نے میرا گاؤں کی ہر عورت کے ساتھ تعلق بنائے رکھا۔ میں اُن سب کے متعلق اِتنا کچھ جانتا ہوں جتنا اُن کے خاوند، منگیتر، عاشق یا گھر والے نہیں جانتے۔ ابھی جو عورت سودا لے کے گئی، میں ابھی تمھیں اُس کے متعلق بتاتا ہوں۔ یہ عورت درمیانے قد کی، مضبوط کاٹھی والی عورت ہے۔ اِس کا چہرہ تنگ اور آنکھیں چھوٹی ہیں۔ اِس کا رنگ ہلکا سانولا ہے۔'' بھائی فقیر حسین شرارت سے مسکرایا۔ ''کتاب نکالو۔'' فیاض نے کونے میں پڑے سٹول پر کھڑے ہو کے کتاب نکالی۔ بھائی فقیر حسین نے کتاب کھولی۔ ''چھوٹی مٹی، مناسب قد، سانولے رنگ، چھوٹی آنکھوں اور تنگ چہرے والی عورت مکار ہوتی ہے۔ اُس پر جو بھی بھروسہ کرے، خطا کھاتا ہے۔ یہ عورتیں تو سانپ کی طرح اپنے بچے بھی کھا جاتی ہیں۔'' بھائی فقیر حسین نے کتاب بند کر کے کچھ دیر سوچا۔ اُس کے ماتھے کی لکیریں گہری اور آنکھوں میں پریشانی تھی۔ ''یہ عورت اِس کے اُلٹ ہے۔ غربت میں بھی اپنے خاندان کو سنبھالے ہوئے ہے۔'' دونوں خاموش بیٹھے اپنے خیالات میں گم رہے۔ فیاض کو لگا کہ کوئی سچ بھائی فقیر حسین کو شکست دے گیا ہے۔ اُس نے کتاب بند کر کے فیاض کی طرف دیکھا۔ ''میرا خیال ہے کہ کتاب نے اتنا بڑا جھوٹ بولا ہے کہ میں پھر وہ بچہ بن گیا ہوں جو ایک دم بڑا ہو گیا ہے۔'' وہ خاموش ہو گیا۔ ''تم بھی میری طرح بڑے ہو گئے ہو۔ چلو اب بڑوں والی باتیں کرتے ہیں۔''

فیاض جب گھر گیا تو وہ دونوں ابھی پہنچے ہی تھے اور صحن میں ایک ہلچل مچی ہوئی تھی۔ ماں خاموشی سے چھت پر چلی گئی تھی اور فیاض صحن والے ہنگامے کو نظر انداز کرتے ہوئے اوپر پہنچ گیا۔ وہ وہاں سے نیچے دیکھتا رہا اور اُسے نیچے اِدھر اُدھر پھرتے ہوئے لوگوں میں ایک مصنوعی پن لگا۔ کیا اُنھیں کچہری میں کوئی مسئلہ پیش آیا تھا؟ بھائی فقیر حسین کا خیال تھا کہ ویگن میں کم لوگوں کا جانا اُن کی شکست تھی۔ وہ ہر گھر سے ایک نمایندہ لے کر جانا چاہتے تھے لیکن ایسے ہوا نہیں کیوں کہ گاؤں کی اکثریت ویلڈ ہو چکی تھی اور شاید اُن پر بھی سارا معاملہ کھل گیا تھا؛ وہ دونوں ایسے معاملات میں تجربہ رکھتے تھے، اُنھیں حالات کے دھارے کا رُخ پہلے ہی نظر آ جاتا تھا اِسی لیے اُنھوں نے ڈیرے کے سامنے اُس کی گالیوں کے بعد اُسے مکمل طور پر نظر انداز کر دیا تھا۔ بھائی فقیر حسین نے بتایا تھا کہ وہ اِس کھوج میں تھے کہ اُن کی مخالفت کا آغاز کس نے کیا؟ اُس نے یہ مہم کئی سالوں سے چلائی ہوئی تھی اور سب کچھ ایک پردے میں ہو رہا تھا۔ اب جب الیکشن کے لیے

ووٹ مانگنے کا سلسلہ شروع ہوا تو کسی نا کسی نے اُنھیں اطلاع کر ہی دینی ہے۔ وہ اِس پردے کے اُٹھنے کے لیے تیار تھا۔

فیاض الیکشن کے عمل میں شامل نہیں ہوا کیوں کہ بھائی فقیر حسین یہی چاہتا تھا۔ الیکشن والے دِن اُسے ڈیرے پر ہی رہنے کا کہا گیا۔ اُس اہم دِن کو ڈیرے پر کسی کا نا ہونا مناسب نہیں تھا۔ اُس دِن کوئی افسر یا عزیز بھی آ سکتا تھا اور جس کے لیے اُس نے وہاں ہی رہنا تھا۔ تھوڑی دیر ڈیرے پر رہنے کے بعد وہ ڈیرے سے تھوڑے فاصلے پر واقعہ پرائمری سکول میں بنائے گئے پولنگ سٹیشن پر چلا گیا۔ وہاں اُسے ایک بجھی بجھی کارروائی دیکھنے کو ملی۔ لوگ مایوس اور خوف زدہ ایک لمبی قطار میں کھڑے تھے جو اُن دونوں کے ووٹروں نے بنا رکھی تھی اور کمہار کے حامیوں والی قطار میں چند لوگ ہی تھے۔ فیاض مایوس سا وہاں کے بجھے ہوئے ماحول کو دیکھتا رہا اور پھر دل گرفتگی کے ساتھ ڈیرے پر آ گیا۔ شام کو جب گنتی ہوئی تو کمہار بھاری اکثریت سے جیت گیا تھا۔ اُس کی جیت کی خوشی میں کوئی ڈھول نہیں پیٹا گیا، نا ہی آتش بازی ہوئی۔ ماں نے تو یہی بتایا تھا کہ الیکشن کا مزہ تو جیتنے والی رات ہوتا ہے جب ڈھول بجتے ہیں، آتش بازی چلتی ہے، نعرے لگائے جاتے ہیں، مٹھائی تقسیم ہوتی ہے، گھروں میں قہقہے بلند ہوتے ہیں، بچے گلیوں میں زندہ باد کے نعرے لگاتے ہیں اور ڈیرے پر لوگ حقوں کے کش لیتے ہوئے دونوں کی تعریفوں کے پل باندھ رہے ہوتے ہیں۔ اِس جیت میں تو کچھ بھی نہیں تھا؛ بس ایک مایوسی ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ کون جیتا؟ کوئی بھی نہیں جانتا تھا۔ وہ دیر تک ڈیرے پر سب سے دور والی چارپائی پر بیٹھا رہا۔ وہ لوگ بھی وہاں آنا شروع ہو گئے جنھوں نے کمہار کو ووٹ دیے تھے اور اُن کی زبان کا رُخ اُن لوگوں کی طرف تھا جنھوں نے اُس ڈیرے کے ساتھ بیوفائی کی تھی جو ہمیشہ اُن کے دکھ درد کا ساجھی رہا تھا۔ وہاں آہستہ آہستہ لوگوں کی تعداد میں اضافہ ہونے لگا اور ایسے لگا کہ پورے گاؤں نے ووٹ تو انھیں ہی دیے تھے لیکن اُن کی مخالفت میں کہیں باہر سے ووٹ ڈالے گئے جب کہ ووٹر فہرست میں صرف گاؤں کے لوگ ہی تھے۔ وہاں بحث یہ تھی کہ اگلا قدم کیا ہو؟ گاؤں کے اردگرد اُن کی زمین تھی اور سب نے یہی مشورہ دیا کہ کسی کو بھی اُس زمین کے آس پاس سے گزرنے کی اجازت نا دی جائے۔

فیاض صبح جب دودھ نکلوانے گیا تو رات کے فیصلے پر عمل درآمد شروع ہو چکا تھا۔

عورتیں، بوڑھے، بچے، مویشی اور کہیں جانے والوں کو زمین میں سے گزرتے راستوں سے واپس بھیجا جا رہا تھا۔ اُن کے خلاف ووٹ دینے والے اب اُن کے سب سے بڑے حمایتی تھے اور وہ لاٹھیاں، بندوقیں یا ڈنڈے تھامے لوگوں کو وہاں سے ہانکتے جاتے تھے۔ دودھ نکالنے والا فیاض کو کھچاؤ میں نظر آیا۔ اُس نے روز کی طرح کسی قسم کی باتیں نہیں کیں، بس دودھ نکالا اور برتن فیاض کے حوالے کر کے چلا گیا۔ دودھ والے نے بھی دودھ کے برتن اُس سے لے گھر پہنچا دیے، اُس نے کسی قسم کی ملاوٹ نا کی۔ فیاض کو اپنی ماں سے سنی ہوئی کہانیاں یاد آ گئیں۔ اُن کہانیوں میں جن جب گاؤں میں آتا تھا تو گلیوں میں خاموشی چھا جاتی تھی اور لوگ ایک دوسرے سے بات چیت نہیں کرتے تھے کہ اُنھیں شک ہوتا تھا کہ جن نے بہروپ بدلا ہوا ہے۔ فیاض کو گلیوں میں جن کی موجودگی کا احساس ہوا۔ وہ بھائی فقیر حسین سے ملنا چاہتا تھا لیکن اُس کا پیغام تھا کہ جب تک اُسے کہا نا جائے وہ ملنے نا آئے۔ فیاض نے اپنے آپ کو اکیلا اور بے بس محسوس کیا۔

وہ راتوں کو کم سوتا تھا اور دِن کو ڈیرے پر بیٹھا وہاں ہونے والی ہر بات سنتا تھا۔ اُسے گاؤں والوں کی منافقت پر حیرت ہوتی۔ اکثریت ویلڈ ہو چکی تھی اور فیاض سوچتا: کیا قسم صرف ووٹ ڈالنے کے لیے ہی تھی؟ اب ڈیرے پر گفتگو کا رُخ بدل چکا تھا۔ وہاں یونین کونسل میں چیرمین کے خلاف عدم اعتماد کی بات کی جا رہی تھی۔ منتخب ہونے والا چیرمین کسی بھی طرح اُن لوگوں کو پسند نہیں تھا جو روایت پسند تھے اور اُس کے خلاف عدم اعتماد مکمل کرنے کے لیے ایک ووٹ کی ضرورت تھی جو کمہار کا ہو سکتا تھا۔ کمہار بھی غیر روایتی تھا لیکن اچانک اُس کی اہمیت بڑھ گئی اور ڈیرے پر اُس کا بھی ذکر اچھے الفاظ میں ہونے لگا۔ فیاض کو یہ رُخ اچھا نہیں لگا۔ ڈیرے پر کمہار کے خلاف نفرت ایک دم ہمدردی میں تبدیل ہو گئی تھی۔ اُسے لگتا کہ بھائی فقیر حسین نے کئی سالوں کی محنت سے جو قلعہ تعمیر کیا تھا دشمن اُس میں شگاف ڈالتے ہوئے محسوس ہوا۔ کیا بھائی فقیر حسین شکست کھا جائے گا؟ وہ جب بھی یہ سوچتا، اُسے انجانا خوف زلزلے کی طرح جھٹکے دینے لگتا۔ اپنے اسی خوف سے چھپنے کے لیے ایک رات وہ بھائی فقیر حسین کے گھر پہنچ گیا۔ وہ جانتا تھا کہ اُن لوگوں نے کھانا کھا لیا ہو گا اور اُسے یہ بھی یقین تھا کہ کھانے کو کچھ اُسے بھی مل جائے گا۔ اُسے اچھا کھانا کھائے ہوئے کئی دِن ہو گئے تھے۔ بھائی فقیر حسین گھر پر نہیں تھا اور اُس کی بیوی

اُسے دیکھ کر خوش ہوئی۔ وہ فیاض کا ہاتھ پکڑ کر برآمدے میں لے گئی اور اُسے اپنے ساتھ چارپائی پر بٹھالیا۔ اُس نے بتایا کہ بھائی فقیر حسین کسی کام سے باہر گیا ہے کسی بھی وقت آ جائے گا اور یہ گلہ بھی کیا کہ وہ کبھی آیا ہی نہیں! فیاض خاموش بیٹھا رہا۔ اُسے اپنے کان جلتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے اور اُس نے سوچا کہ اگر وہ بولا تو خاموشی جو لطف دے رہی ہے ختم ہو جائے گا۔ وہ اِسی طرح خاموش رہتے ہوئے بھائی فقیر حسین کی بیوی کی باتوں سے سیراب ہونا چاہتا تھا۔ پھر اُس دِن کی طرح بھائی فیاض فقیر حسین کی بیوی نے پہلے کان پر ہاتھ رکھا، سر پر پیار سے تھپکی دینے کی شاید ضرورت نہیں تھی۔ اِس لمس سے فیاض کے بدن میں ایک سنسنی دوڑ گئی۔ وہ اُسی طرح اپنے اندر سمٹا بیٹھا رہا۔ ہاتھ کان کی لو پر آ کے رکا اور فیاض کو سرمستی، خوف، اُلجھن اور اُمید کی جھرجھری اپنے بدن میں سے گزرتے ہوئے محسوس ہوئی۔ ہاتھ گردن پر تھا اور فیاض نے چاہا کہ وہ دھیرے سے اُس کا گلا دبا دے؛ شاید اِس کا اپنا ایک لطف ہو۔ اُسی وقت کنڈی کھٹ کھٹ ہونے لگی اور وہ ایک نگاہِ غلط سے اُسے دیکھتی ہوئی صحن عبور کر گئی۔ بھائی فقیر حسین اپنی بیوی کے پیچھے آ رہا تھا اور اُس کی بیوی بے کراں چاہت سے فیاض کو دیکھتے ہوئے مسکراتی تھی اور وہ گم سم اُسے دیکھتا تھا۔ فیاض کو اچانک اپنے بدن میں سے عجیب قسم کی آواز اُٹھتے محسوس ہوئی جیسے گرم لوہے پر پانی ڈالا جا رہا ہو۔ اُس نے گھبرا کر بھائی فقیر حسین کی طرف دیکھا۔ اُسے محسوس ہوا کہ یہ آواز اُس تک نہیں پہنچی اور اُس نے طمانیت میں ڈوبی ایک لمبی سانس لی۔ بھائی فقیر حسین اُس کے سامنے بیٹھ گیا۔ اُس کے ہونٹوں پر ہمیشہ والی پراسرار مسکراہٹ تھی۔

''مجھے خبر ملتی رہتی ہے۔'' بھائی فقیر حسین نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ فیاض خاموش اُسے دیکھتا رہا۔ وہ اُسے ایک معصوم آدمی لگا جو اپنی سوچ اور خلوص میں ڈوبے اعتماد کا غلام تھا۔ اُس نے سوچا کہ بڑا ہو کے وہ بھی بھائی فقیر حسین جیسا ہی بنے گا۔ اُسی وقت بھائی فقیر حسین کی بیوی کھانا لے کے آ گئی۔ اُبلے ہوئے چاولوں میں سے خوشبو اور دھواں ایک ساتھ اُٹھ رہے تھے۔ اُسے دھان کے جوان ہونے کے وہ دِن یاد آ گئے جب ہر طرف ایسی خوشبو پھیلی ہوتی ہے۔ چاولوں کے ساتھ ثابت مسور تھے اور پیاز تھا اور آم کا اچار۔ اُس کا منہ کھانے کی خوشبو کی وجہ سے اتنے پانی سے بھر گیا کہ اُسے گھونٹ بھرنا پڑا۔ اُس نے اشارے کا انتظار کیے بغیر تھالی چالوں سے بھر کے اُن پر مسور اُنڈیل لیے۔ بھائی فقیر حسین دل چسپی سے اُسے دیکھتا رہا۔ پھر اُس نے بھی اپنی

پلیٹ بھری اور دہرایا: ’’مجھے خبر ملتی رہتی ہے۔‘‘

فیاض نے اُس کی طرف دیکھا۔ بھائی فقیر حسین کی بیوی اُس کی چارپائی پر بیٹھ گئی تھی۔ فیاض کو اپنا گلا سکڑتے ہوئے محسوس ہوا لیکن بھوک اتنی شدید تھی کہ وہ کھاتا ہی گیا۔ ’’کمہار پر دباؤ ڈالا جا رہا ہے۔‘‘ فیاض نے چاول حلق سے نیچے اُتارتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔ ’’وہ دباؤ کے نیچے بے بس ہوتا جا رہا ہے۔ وہ اُسے گاؤں کی عزت کا واسطہ دے رہے ہیں۔ تمھارا خاندان شاید اِسی لیے اُن سے الگ ہو گیا تھا کہ اُن میں وہ منافقت نہیں تھی جو یہ لوگ اپنے اندر چھپائے پھرتے ہیں۔ یہ کچھوے کی طرح ہیں۔ وقت آنے پر خرگوش سے آگے نکل جاتے ہیں ورنہ اپنے اندر ہی چھپے رہتے ہیں۔ اگر کمہار اُن کے ساتھ مل بھی جاتا ہے تو ہماری جدوجہد ختم نہیں ہوگی۔‘‘ بھائی فقیر حسین نے پانی کا گھونٹ لیا۔ فقیر حسین کی بیوی فیاض کی تھالی پر نظر رکھے ہوئے تھی اور جیسے ہی کچھ کم ہوتا وہ فوراً بھر دیتی۔ ’’اب تمھارا وہاں رہنا مناسب نہیں۔ تم کل سے یہاں آیا کرو۔‘‘ بھائی فقیر حسین کی بیوی ایک دم مسکرا اُٹھی۔ اُس کی مسکراہٹ میں کوئی حجاب نہیں تھا۔ فیاض کو ایک دم اپنا گلا خشک ہوتے محسوس تو ہوا لیکن اُسے ایک آزادی کا پیغام بھی ملا۔ وہ بھائی فقیر حسین کی دکان پر اپنی مرضی کا خود مالک ہوگا۔ اُس کی ماں بتایا کرتی ہے کہ اُس کے باپ کا بھی یہی اعتراض ہوتا تھا۔ اُسے ڈیرا اپنی آزادی پر پابندی کی ہتھکڑی کی طرح لگا کرتا تھا۔ وہ ماں کی بات کو کبھی سمجھ نہیں پایا تھا اور اب جب اُسے یہاں آنے کا کہا گیا تو اُسے اپنے باپ کی سوچ کی سمجھ آئی۔ ڈیرے پر وہ سب سے پرلی چارپائی پر بیٹھا خود کو اُس مجرم کی طرح محسوس کرتا تھا جس کی ابھی تفتیش شروع نہیں ہوئی تھی۔ اب یہاں عورتوں کی خصوصیات والی کتاب شاید رکھنے میں نا ہو لیکن وہ جب چاہے کھل کے بات کر سکتا تھا۔ اُسے اچانک محسوس ہوا کہ اُس نے یہاں آنے کے بعد ابھی تک کوئی بات ہی نہیں کی تھی۔ وہ اپنے اندر ہی مسکرا دیا۔ اُس نے فوراً بھائی فقیر حسین کی طرف دیکھا جو لاتعلقی سے سگریٹ کا کش لینے کے بعد منہ سے دھواں نکال رہا تھا۔ پھر اُس نے پاس بیٹھی بھائی فقیر حسین کی بیوی کی طرف دیکھا جو اُسے دیکھتے ہوئے مسکرا رہی تھی۔ وہ بھی جواب میں مسکرا دیا۔ مسکراتے ہی اُسے اپنے اندر ایک کمی کا احساس ہوا؛ اُسے لگا کہ بھائی فقیر حسین کی طرح گلی میں کھیلتے بچے سے ایک رات کے اندر ہی وہ اتنا بڑا ہو گیا ہے کہ بھائی فقیر حسین کی بیوی اُسے چھو کے پھول کی طرح کھل اُٹھتی ہے۔ اُس نے ایک لمبی سانس لی۔ بھائی فقیر حسین کی بیوی

نے چونک کر اُس کی طرف دیکھا۔اب اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نہیں تھی۔فیاض نے کوئی بات کرنا ضروری سمجھا۔

''کیا کمہار سچ مچ اُس طرف چلا جائے گا؟''فیاض کو اپنی آواز پر یقین نا آیا۔یہ آواز گھٹی گھٹی اور کسی کانٹوں سے بھرے ہوئے گلے سے نکلی تھی۔اُس نے سوال تو کر دیا پھر اُسے خیال آیا کہ خاموشی ہی بہتر ہوتی ہے۔اُسے سوال کرنے اور جواب دینے والا اپنے ہی دور کے غلام لگے۔ کیا وہ ڈیرے کی غلامی سے آزادی حاصل کر کے بھائی فقیر حسین کی غلامی میں آ رہا تھا؟ کیا بھائی فقیر حسین بھی غلام تھا؟فیاض نے سوچا کہ بھائی فقیر حسین تو دہرا غلام ہے۔وہ ڈیرے والوں کی غلامی سے نجات حاصل نہیں کر سکا تھا کہ وہ اپنا ہی غلام بن گیا۔اُس کی یہ غلامی کیا کمہار کی بے وفائی میں پوشیدہ تھی؟

''وہ اب کمہار نہیں رہا۔''بھائی فقیر حسین نے ہنستے ہوئے کہا۔فیاض کو اُس کی ہنسی میں ہمیشہ والی خوشی محسوس نہیں ہوئی۔اُسے لگا کہ اُس ہنسی میں شکست تھی۔''وہ اب سیٹھ کہلوانے لگا ہے۔''بھائی فقیر حسین پھر ہنسا۔اِس بار ہنسی میں دل چسپی کا پہلو بھی تھا۔''شاید سیٹھ ہم غریبوں کے ساتھ اب چل نہیں سکے گا۔کمہار کے ڈیرے والوں کے ساتھ شامل ہو جانے کے بعد شاید میری ساکھ بھی نا رہے اور مجھے اپنے کاروبار تک ہی خود کو محدود رکھنا پڑے اور جو تبدیلی میں لانا چاہتا تھا شاید نا لا سکوں۔''فیاض کو پوری بات کی سمجھ نہیں آئی لیکن وہ اتنا جان گیا کہ بھائی فقیر حسین نے شکست قبول کر لی ہے۔اُس نے بھائی فقیر حسین کی بیوی کی طرف دیکھا۔اُسے،اُس کے چہرے پر بھی پریشانی دکھائی دی اور پھر اُن کی نظر ملی اور وہ مسکرائی۔اُس کی مسکراہٹ میں بھی شکست تھی۔ فیاض کو محسوس ہوا کہ اُسے کوئی بات کرنی چاہیے۔اُن دونوں کو شکست خوردہ دیکھ کے اُسے بھی شکست کا احساس ہونے لگا۔اُس نے کچھ کہنے کے لیے ذہن میں الفاظ ترتیب دینے شروع کیے ہی تھے کہ باہر کا دروازہ کھٹکھٹایا جانے لگا۔بھائی فقیر حسین نے ناپسندیدگی کے ساتھ دروازے کی طرف دیکھا اور پھر اپنی بیوی کو جا کے دیکھنے کا اشارہ کیا۔اُس نے دروازہ کھول کے باہر دیکھا اور ایک طرف ہٹ کر گال پھلا کے بازو کھولتے ہوئے موٹے کا اشارہ بنایا۔بھائی فقیر حسین نے اثبات میں سر ہلایا اور فیاض کی طرف مڑ کے سرگوشی کی:''کمہار!''

اُسی وقت گول مٹول کمہار سفید کرتے اور چادر میں اُن کی طرف لڑھکتا ہوا بڑھا۔بھائی

فقیر حسین نے فیاض کو کھانے کے برتن اُٹھانے کا اشارہ کیا تو اُس کی بیوی نے تیزی سے آگے بڑھ کے فیاض سے پہلے ہی تھال میں سب کچھ رکھ لیا۔ کمہار فیاض والی چار پائی پر بیٹھ گیا اور فیاض پائینتی کی طرف کھسک گیا۔ ''دھیے! کھانا، پینا کچھ نہیں۔'' اُس نے بھائی فقیر حسین کی بیوی کو مخاطب کیا۔ وہ کچھ بولنے لگی تو اُس نے ہاتھ کے اشارے سے خاموش کرا دیا۔ کمہار نے فیاض کی طرف دیکھنے کے بعد بھائی فقیر حسین کی طرف سوالیہ نظر سے دیکھا۔

''یہ میرا پہلا ساتھی ہے۔ تم بلا جھجک بات کرو۔'' کمہار نے لمبی سانس لی۔

''ڈیرے سے تمھیں کوئی بلاوا آیا ہے؟'' کمہار نے پوچھا۔ فیاض نے ایک دم چونک کے کمہار کی طرف دیکھا جسے اُس نے بھی محسوس کیا۔ اُسے اپنے اِس ردِعمل کی توقع نہیں تھی اور اُسے اپنے چونکنے پر حیرت بھی ہوئی۔

''نہیں! اگر آیا تو میں نے جانا نہیں ہے۔'' بھائی فقیر حسین کی آواز میں غصہ تھا اور اِس بار فیاض نے چونکے بنا اُس کی طرف دیکھا۔ وہاں کچھ دیر کے لیے خاموشی ہو گئی۔ فیاض نے چاروں طرف دیکھا تو بھائی فقیر حسین کی بیوی تھوڑے فاصلے پر، پیچھے کی طرف، ایک موڑھے پر بیٹھی تھی۔ اُس کی جب فیاض سے نظر ملی تو وہ مسکرا دی۔ فیاض نے سوچا: یہ ہر بار مسکرا کیوں دیتی ہے؟ کیا اِسے بھائی فقیر حسین کا کوئی ڈر نہیں ہے؟

''ویسے جانے میں حرج بھی نہیں۔'' کمہار نے سوچتے ہوئے بات شروع کی۔ ''تم تک ہر اطلاع غلط شکل میں پہنچ رہی ہے.....''

''صحیح شکل کیا ہے؟'' بھائی فقیر حسین نے اُسے ٹوکا۔

''صحیح شکل وہی ہے جو پہلے دِن تھی۔'' وہ رکا، اُس نے بھائی فقیر حسین کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے کہا۔ ''مجھے مسلسل پیغام آ رہے ہیں۔ میں نے کسی کا کوئی جواب نہیں دیا۔ میری طرف سے وہ خود ہی جواب بنا کے سب کو سناتے رہتے ہیں کہ اب میں نے یہ کہا ہے اور اب وہ کہا ہے جب کہ میں نے کچھ بھی نہیں کہا ہے۔ آج مجھے ایک نیا پیغام ملا ہے۔'' اُس نے بھائی فقیر حسین کے جواب کا انتظار کیا۔ فیاض بھی وہ سوال سننے کے لیے مزید توجہ سے ہو گیا اور پھر اُس نے بھائی فقیر حسین کی بیوی کی طرف دیکھا۔ اُس کی بھی تمام توجہ کمہار کی طرف تھی اور اِس بار وہ مسکرائی نہیں۔ ''وہ پیغام یہ ہے کہ اگر میں اُن کے ساتھ شامل ہو جاؤں تو وہ مجھے چیئرمین بنوا دیں

گے۔اب اِس کے پیچھے کیا سیاسی چال ہے، میں نہیں جانتا۔اور میں نے وہی کرنا ہے جو ہم دونوں طے کر لیں۔'' فیاض کو یہ نئی صورتِ حال دل چسپ لگی اور اُس نے پھر بھائی فقیر حسین کی بیوی کی طرف دیکھا۔اِس بار وہ مسکرا دی۔

''ہم کیسے کہہ سکتے ہیں کہ وہ تمھیں ہی چیرمین بنوائیں گے؟'' بھائی فقیر حسین نے بے یقینی سے کہا۔

''اِسی لیے تو میں آیا ہوں۔'' اُس نے کچھ سوچتے ہوئے بات جاری رکھی، ''کہیں ہمارے ساتھ دھوکہ نا ہو جائے؟''

''تمھیں چیرمین بننے میں دل چسپی ہے؟ مجھے نہیں۔ مجھے صرف اُس ڈیرے کی مات چاہیے۔'' بھائی فقیر حسین کی آواز میں ایک کرختگی تھی۔فیاض کو اچانک خوف محسوس ہوا۔اُسے گلیوں والا واقعہ یاد آ گیا جو بھائی فقیر حسین نے سنایا تھا۔اُسے ڈیرے والوں کا خوف زدہ ہو جانا کوئی حیرانی کی بات نہیں لگی۔کمہار بھی کچھ دیر خاموش بیٹھا رہا۔

''میں اُنھیں کیا جواب بھیجوں؟'' فیاض کو کمہار کی آواز میں جھجک محسوس ہوئی۔اُسے لگا کہ شاید وہ بھی اُس کی طرح خوف زدہ ہو گیا ہو۔وہاں کچھ دیر خاموشی رہی۔فیاض بار بار پیچھے مڑ کے بھائی فقیر حسین کی بیوی کی طرف دیکھتا تھا۔اُسے محسوس ہوا کہ وہ اُس کی طرف دیکھ کے شاید اپنے اندر طاقت پیدا کرنے کے لیے اُس کی مسکراہٹ کی تائید چاہتا ہے لیکن اب وہ خالی نظروں سے اُس کی طرف دیکھے جا رہی تھی۔

''یہی کہ تم اپنا ووٹ کسی کو نہیں دو گے، بلکہ تم اپنے طور پر چیرمین کھڑے ہو۔ تمھیں بے شک کوئی بھی ووٹ نا دے۔تمھارا اپنا ووٹ تو ہو گا ہی۔ٹھیک ہے؟'' بھائی فقیر حسین کے فیصلے کے بعد وہاں پھر خاموشی چھا گئی۔فیاض کو اِن وقفوں سے تھوڑی اُلجھن ہونے لگی۔وہ چاہتا تھا کہ بات چلتی رہے۔بات چلتے رہنے سے سوچ بھٹکتی نہیں۔وہ چاہتا تھا کہ فیصلہ جلد ہو تا کہ اُس کے اندر زور پکڑتا ہوا کھچاؤ کم ہو۔

''میں اب خود چیرمینی کا اُمیدوار ہوں۔میں ووٹ کے لیے ڈیرے پر پیغام بھجواؤں؟'' فیاض کو کمہار کی آواز میں اعتماد کی کمی لگی۔ بھائی فقیر حسین نے سگریٹ سلگایا اور آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے ناک میں سے دھواں نکالا اور تھوڑا سا ہنسا۔فیاض کو لگا کہ اُس کی اِس چھوٹی سی ہنسی

میں ایک طاقت تھی۔ اُس نے مڑ کے بھائی فقیر حسین کی بیوی کی طرف دیکھا؛ وہ مسکرا رہی تھی۔

''نہیں۔ دوسری پارٹی کو بھجواؤ۔ انھیں بتاؤ کہ اب اور ممبر توڑنا اُن کے ذمے ہے۔ وہ یقیناً کچھ کریں گے۔ کم از کم گنتی برابر رہ جائے گی۔'' اب کمہار نے ایک ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ فیاض کو اُس کے قہقہے کی سمجھ نہیں آئی۔ کیا وہ بھائی فقیر حسین کا مذاق اُڑا رہا تھا یا واقعی یہ ممکن تھا۔ فیاض کو یہ ممکن لگا۔

''اُنھیں آج رات کو پیغام بھیج دیا جائے گا۔'' وہ اُٹھ کھڑا ہوا اور بھائی فقیر حسین اُس کے پیچھے چل پڑا۔ فیاض نے مڑ کے بھائی فقیر حسین کی بیوی کی طرف دیکھا۔ اُس نے ہونٹوں پر زبان پھیری، مسکرائی اور اُسے بیٹھے رہنے کا اشارہ کیا۔ اُسے اپنے کان گرم ہوتے محسوس ہوئے۔ اُسے لگا کہ وہ بھی یہی چاہتا تھا۔ بھائی فقیر حسین واپس آ کے اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔ وہاں پھر خاموشی ہو گئی۔

''کیا رائے ہے؟'' فیاض کو اِس سوال کی توقع نہیں تھی۔ وہ کچھ گھبرا بھی گیا۔ اُس نے تیزی کے ساتھ سوچنے کی کوشش کی لیکن اُس کے دماغ میں کچھ بھی نہیں آیا۔ وہ خاموش بیٹھا اُسے دیکھتا رہا۔ ''میرا خیال ہے کہ اُسے میرا مشورہ پسند نہیں آیا۔''

''کیوں؟'' فیاض کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ اُسے اپنی آواز کچھ اونچی بھی لگی اور اُسے کچھ خفت بھی محسوس ہوئی۔

''اِس لیے کہ وہ اُن کے ساتھ طے کر چکا ہے۔ یہاں وہ صرف میری تسلی کے لیے آیا تھا۔'' اُس نے تازہ سگریٹ سلگایا۔ ''تم صبح یہاں آ رہے ہو۔'' بھائی فقیر حسین نے اُسے یاد دلایا۔ وہ اگر نہ بھی یاد دلاتا تو اُسے یاد تھا۔ وہ اُٹھ کھڑا ہوا اور ایک نظر پیچھے ڈال کے باہر کی طرف چل پڑا۔ بھائی فقیر حسین کی بیوی کنڈی لگانے اُس کے پیچھے آئی۔ دروازے پر وہ مسکرائی، ہونٹوں پر زبان پھیری اور پھر مسکرائی!

••••• وہ ابھی چودہ برس کا تھا کہ وہ رفیق کاریگر جانا جانے لگا۔ اُس کا باپ خدا بخش گاؤں میں ہر دل عزیز ترکھان تھا۔ خدا بخش کا کوئی اڈا نہیں تھا۔ اُس کے پاس چمڑے کا ایک جھولا تھا جس میں وہ اپنے اوزار رکھتا اور صبح ہوتے ہی گھر سے نکل پڑتا۔ اُس نے جھولے میں تیشہ، آری، سنہی، بڑی اور چھوٹی ہتھوڑی، چھینی، رمبا، رمبی، رندا، ریتی، ٹکورا، روات، سَتھرا، ستھری، چھوٹا سنبا، برما اور روئی ڈالے ہوتے۔ چمڑے کا یہ جھولا ہی اُس کا اڈا تھا۔ وہ دن نکلتے ہی گھر سے نکل پڑتا۔ ہر حویلی میں جا کے ٹوکوں کی چھُریاں دیکھتا اور اگر ضرورت ہوتی تو اُنھیں تیز کرتا، اگر کوئی کیلا اُکھڑ یا ٹوٹ گیا ہوتا تو حویلی سے ہی لکڑی لے کے نیا گھڑتا، لکڑی کی کسی کھرلی کو اگر پچھلے چوبیس گھنٹوں میں کوئی نقصان پہنچ گیا ہوتا تو اُسے مرمت کرتا، باہر کنوؤں پر جا کے مرمت طلب کام کرتا، گھروں میں چارپائیوں کی کان نکالتا، پھانا ٹھوک کر پایوں کو سیدھا رکھتا، دروازوں کی لروں کے سوراخوں کو بند کرتا، بچوں کے گڈیرے مرمت کرتا اور اگر کہیں ضرورت ہوتی تو تھوڑا سا بالن بھی چیر دیتا۔ اِس سارے کام کے بدلے اُسے ششماہی جنس ملتی، گھروں سے چوپڑی ہوئی روٹیاں، سالن، دال، اچار، دودھ کا چھنا، مکھن کا پیڑا، لسی کی دوہنی، کسی دِن چادر اور کسی دِن قمیص یا کرُتہ اور کبھی کوئی نقدی بھی مل جاتی۔ وہ اپنا کام ختم کر کے جب گھر پہنچتا تو اُس کے پاس اگلے چوبیس گھنٹوں کے لیے کھانے کا بندوبست ہوتا۔ اُس کی بیوی گھر میں کچھ نا کچھ کرتی رہتی اور رفیق کاریگر بچوں کے لیے گڈیرے بناتا رہتا۔ اُس کے بنائے ہوئے گڈیرے وہ نہیں تھے جو شہر میں دکانوں پر ملتے تھے۔ وہ اُن گڈیروں میں پہیے نہیں لگاتا تھا کیوں کہ وہ ہر قسم کی سطح پر نہیں چل سکتے تھے۔ وہ کچھ ایسا بندوبست کرتا کہ تھوڑا دھکیلنے سے گڈیرا بغیر پہیوں سے بھی چل پڑتا۔ اُس نے پہیوں کی جگہ پر دو ڈنڈوں کو رندے سے اتنا گول کر کے لگایا ہوتا کہ وہ پہیوں سے بھی تیز چلتے اور کوئی رکاوٹ اُنھیں روک نا سکتی۔ ایک دِن رفیق کاریگر نے بندر کو درخت پر چڑھتے ہوئے بنانے کا سوچا۔ اُس نے ایک ڈنڈا لے کے اُسے گول کرنے کا فیصلہ کیا۔ جب وہ ڈنڈا اُتنا گول ہو گیا

جتنا کہ اُسے چاہئے تھا تو اُس نے اُس پر اُس طرح کی لکیر بنانے کا فیصلہ کیا جیسے اُس کا باپ اُسے بندوقوں کی نالیوں میں موجود ہونے کا بتایا کرتا تھا۔ اُن کے پاس بٹ کی مرمت کے لیے ایک رائفل آئی جس کی نالی اُس نے غور سے دیکھ رکھی تھی اور چھینی کے ساتھ ہاتھ سے ڈنڈے پر ویسے ہی لکیر بنانی شروع کر دی جیسے کہ رائفل کی نالی میں تھی۔ نالی میں لکیر چکر کاٹتے ہوئے جا رہی تھی اور محسوس ہو رہا تھا کہ وہ کبھی ختم ہی نہیں ہوگی۔ یہ ایک مشکل کام تھا لیکن اُس نے کبھی کوئی کام مشکل سمجھا ہی نہیں تھا۔ وہ بہت توجہ کے ساتھ وہ لکیر کھودتا رہا اور ساتھ ساتھ ڈنڈے کی گولائی کو متوازن رکھتا گیا۔ جب وہ مطمئن ہو گیا کہ رائفل کی نالی میں کھدی ہوئی لکیروں اور اُس کے ڈنڈے کی لکیر میں کوئی فرق نہیں رہا تو اُس نے اگلا قدم اُٹھانے کا فیصلہ کیا۔

رفیق کئی دِن اُس ڈنڈے کی ہموار سطح کو محسوس کرتا رہا کہ کہیں سے وہ غیر ہموار تو نہیں تو اُس نے اپنے تجربے کو آگے لے کر جانے کا طے کیا۔ اُس نے لکڑی کے ایک ٹکڑے پر پنسل سے چند نشانات لگائے اور پھر اُنھیں کھرچنا شروع کر دیا اور جیسے جیسے وہ کھرچتا گیا وہاں بندر سے ملتی ایک شکل وجود پانے لگی۔ رفیق نے گھر کے ایک کونے میں اپنا اڈا بنایا ہوا تھا جہاں وہ اپنی دنیا میں گم بیٹھا کچھ نا کچھ کرتا رہتا۔ وہ اپنے خیال میں ایک اہم کام کر رہا تھا اور اگر اُسے کامیابی ہوئی تو اُس نے سوچا کہ وہ ایسے کھلونوں کو بیچنا شروع کر دے گا۔ جب بندر بن چکا تو وہ کئی دِن اُسے دیکھتا رہا۔ متواتر دیکھتے رہنے سے اُسے اپنے مسئلے کا حل نظر آ گیا۔ اُس نے بندر کے اندر ایک باریک سوراخ نکال کر اُس میں بھی وہی لکیر بنانا شروع کر دی جو اُس ڈنڈے پر تھی۔ اُس نے بندر کے اندر سے گزرتی لکیر کی پیائش ڈنڈے جتنی ہی رکھی۔ جب اُس کے مطابق بندر کی لکیر کی پیائش وہی بن گئی جو ڈنڈے کی تھی تو وہ خوف زدہ ہو گیا۔ اُسے اپنی تمام محنت ایک طرح کا پاگل پن لگا۔ جو وہ کرنے جا رہا تھا ابھی تک ایسا گاؤں میں یا ارد گرد کہیں نہیں ہوا تھا۔ اُس نے اپنے آپ کو تسلی دی کہ اگر وہ کامیاب نا ہوا تو کسی کو اُس کے منصوبے کے بارے میں کوئی علم نہیں تھا۔ اب وہ گہرے ارتکاز کے ساتھ ڈنڈے اور بندر کے اندر سے گزرتے سوراخ کی لکیر کو غور سے دیکھتا رہتا۔ پھر ایک دِن اُس نے بندر کو ڈنڈے پر ایسے رکھا کہ دونوں لکیریں معمولی سے فرق کے بغیر بھی ایک دوسرے کے ساتھ جڑی ہوئی ہوں۔ وہاں اُسے پیائش میں کوئی کمی یا بیشی محسوس نہیں ہوئی اور اُس نے بندر پر تھوڑا سا دباؤ ڈالا اور بندر رفیق کے دباؤ کے نیچے ڈنڈے پر تھوڑا نیچے کو

پھسلا۔ رفیق نے مزید دباؤ بڑھایا تو بندر نیچے تک چلا گیا۔ اُس نے ایسے ہی بندر کو اوپر کی طرف چلایا اور اُسے کامیابی ہوئی۔ چند بار ایسے کرنے کے بعد بندر کی اوپر اور نیچے کی حرکت میں کوئی رکاوٹ نا رہی اور اُس کی رفتار بھی تیز ہوگئی۔ اب رفیق ہر وقت اپنی ایجاد کو ساتھ رکھتا اور لوگ اُسے بندر کو حرکت دیتے ہوئے دیکھتے۔ ہر جگہ اُس کی کاریگری کی بات ہوتی جو چلتے چلتے ڈیرے تک بھی پہنچ گئی اور ایک دِن اُسے وہاں سے بلاوا آ گیا۔ وہاں سے جب بھی کسی کو بلاوا آتا تو وہ جھجکتے ہوئے جاتا۔ رفیق کے پاس جانے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔ وہ جب گیا تو بندر اُس کے ہاتھ میں نہیں تھا۔ وہ احتیاطاً بندر کو گھر ہی چھوڑ آیا تھا۔

''اوئے مستری کے بچے! تیرا ابا وہ بندر کہاں ہے؟'' رفیق کو گولے خان کے لہجے پر حیرت ہوئی۔ وہ خاموشی سے اُسے دیکھتا رہا، ''بول! کیا قدرت نے تیری زبان چھین لی ہے۔ وہ بندر ادھر دے۔ تم نیا بنا لو گے، یہ میرے بیٹے کو چاہیئے۔'' رفیق خاموشی سے اُسے دیکھتا رہا۔ اُس کے پاس جواب دینے کے لیے کوئی الفاظ نہیں تھے۔ وہ ڈرا ہوا بھی نہیں تھا؛ بس خاموشی سے گولے خان کو تکے جاتا تھا۔

رفیق کچھ کہے بغیر واپس مڑ گیا۔

اُس نے خود کو ایک مشکل میں پایا۔ ڈیرے والے اُس کے کام کی تعریف کیے بغیر اُس کا مکمل شدہ کام اپنے قبضے میں کرنا چاہتے تھے۔ وہ اپنی محنت اُن کے سپرد کر کے کیا دوبارہ اُسی راہ پر چلے؟ اور جب وہ مکمل ہو جائے تو دوسرے کے بیٹے کے سپرد کر دے۔ اُسے لگا کہ یہ سلسلہ ایسے ہی چلتے رہنا ہے۔ جو بھی اُن سے طاقت ور ہو اوہ اپنے بیٹے کے لیے اُس کے بندر کا تقاضا کرتا رہے گا۔ اُسے کمزور ہونا بھی ایک کمزوری لگا۔ وہ اتنی محنت اور شوق سے بنائے ہوئے اپنے کھلونے کو کسی کے سپرد کیوں کرے؟ وہ جب گھر پہنچا تو اُس کا باپ انتظار میں تھا اور رفیق اُسے دیکھتے ہی رو پڑا۔

''کسی نے کچھ کہا؟'' خدا بخش کی آواز میں پیار، ہمدردی اور غصہ تھا۔

''وہ میرا بندر مانگتے ہیں۔'' رفیق نے سسکیوں کے درمیان اور میں کہا۔

''تو دے دو۔ میں نیا بنانے میں تیری مدد کروں گی۔'' رفیق کی ماں نے معاملہ رفع دفع کرنا چاہا۔

''اگر وہ نہیں دینا چاہتا تو کیوں دے؟ وہ بہت برے لوگ ہیں ۔تم اپنا بندر اُٹھاؤ اور راتوں رات شہر بھاگ جاؤ۔ اللہ مالک ہے۔ اپنا بندر بھی ساتھ لے جاؤ۔تم کاریگر ہو ایک آدھ دِن میں کہیں نا کہیں اپنا بندوبست کر ہی لو گے۔''

''ہمارا کیا بنے گا؟'' رفیق کی ماں نے سسکی لی۔

''کچھ نہیں۔ یہی کہیں گے کہ وہ بس کچھ بتائے بغیر کہیں چلا گیا۔ اور سنو! تم نے اِس سے زیادہ کہیں کوئی بات نہیں کرنی۔ سمجھ آئی؟ کوئی معتبری دکھانے یا ہمدردی حاصل کرنے کی ضرورت نہیں۔ جاؤ بیٹا۔ چپ کر کے نکل جاؤ، میرے پاس کچھ پیسے ہیں لے جاؤ اور جب تمھارا کام بن جائے تو کبھی کبھار آ کے مل جانا۔ ہمارے ہاتھ میں ہنر ہے۔ کہیں اور بیٹھ کے منجی پیڑھی ٹھوک لیں گے۔ شاباش اب جاؤ۔ یہ بہت بُرے لوگ ہیں۔''

اور رفیق رات کے اندھیرے میں شہر کی طرف جانے والے راستے کے اندھیرے میں گم ہو گیا۔

شہر اُس کے لیے اِتنا نیا نہیں تھا۔ وہ اپنے باپ کے ساتھ ہتھیاروں کی مرمت کے لیے کبھی کبھار آتا رہا تھا۔

رفیق اُن سب جگہوں پر گیا جہاں وہ اپنے باپ کے ساتھ جاتا رہا تھا۔ شہر سے واقفیت ہونا کوئی اور بات تھی جب کہ کام ڈھونڈنا اُسے مشکل لگ رہا تھا لیکن اُس نے ہمت نا ہاری۔ وہ راتوں کو دکانوں کے سامنے ایسے سوتا کہ ہلکے سے کھٹکے پر بھی جاگ جائے۔ وہ کام ڈھونڈتے ہوئے لاری اڈے پر پہنچ گیا جہاں کئی ورکشاپیں اور خراد مشینیں تھیں۔ ہر ورکشاپ میں اُس کی عمر کے لڑکے کام کر رہے تھے اور خراد کی مشینوں پر تجربہ کار لوگ اُسے ہر وقت کام میں مصروف نظر آتے۔ وہ روزانہ وہاں چکر لگاتا۔ ایک دِن اُسے ایک کمرہ نظر آیا جہاں کوئی کام نہیں ہو رہا تھا اور باہر لکھا ہوا ''نمبر ایک خراد مشین'' اور دکان کے سامنے ایک آدمی اخبار پڑھنے میں مصروف تھا۔ رفیق نہیں جانتا تھا کہ یہ آدمی جو اخبار پڑھنے میں مصروف ہے پوری مارکیٹ میں سب سے زیادہ کاریگر اور لاتعلق ہے۔ اُسے کام کرنے کے بجائے فارغ بیٹھنے میں ہی دل چسپی تھی۔ وہ اخبار پڑھتا، چائے پیتا اور اپنے پڑوسیوں سے باتیں کرتا۔ وہ سب چاہتے تھے کہ وہ ایسے ہی فارغ بیٹھا رہا کرے تا کہ وہ اپنے کام کی طرف توجہ نا دے۔ رفیق کچھ دیر کھڑا اُسے دیکھتا رہا کہ وہ آدمی اُس

کی طرف متوجہ ہو۔ اُس نے گلا صاف کیا تو آدمی نے ناگواری سے اُسے دیکھا۔ رفیق کو اُس کی اِس ناگواری میں بھی ایک اپنایت کا احساس ہوا۔ وہ تھوڑا سا مسکرایا۔ یہ مسکراہٹ اُس نظر نا آنے والی اپنایت کے جواب میں تھی۔

''آپ کو کوئی مدد گار چاہیے؟'' رفیق نے ایک طرح کی خوش اخلاقی اور عدم دل چسپی کے ساتھ پوچھا۔ وہ کسی بھی طرح بے تاب اور لاتعلق نظر نہیں آنا چاہتا تھا۔ وہ آدمی کچھ دیر اُسے دیکھتا رہا۔ پھر اُس کی چہرے پر نرماہٹ پھیل گئی۔

''تمھیں کام چاہیے؟'' اُس آدمی کی آواز میں رفیق کو ہمدردی کا احساس ہوا۔ رفیق تھوڑا قریب ہو کے کھڑا ہو گیا۔ اُس آدمی کا لہجہ دھیما تھا۔

''کیا کر سکتے ہو؟ مشین چلانی آتی ہے؟''

''نہیں آتی لیکن بہت جلد سیکھ جاؤں گا۔ آپ ایک مرتبہ سمجھا دیں۔''

اُس آدمی کو رفیق کی بات میں سچ کا خلوص نظر آیا۔ وہ اُٹھا اور اندر چلا گیا۔ وہاں سے کچھ دیر بعد اُس نے رفیق کو اندر آنے کا اشارہ کیا۔ رفیق خوف زدہ ہو گیا لیکن اُس کے لیے اندر جانا بھی ضروری تھا۔ رفیق جب اندر گیا تو اُس آدمی نے کہا: ''اِس طرح کا نٹ بناؤ۔ جو مدد ابھی چاہیے پوچھ لو۔ بعد میں مَیں نے اندر نہیں آنا۔''

رفیق نے اُس کی ہتھیلی پر رکھے نٹ کو کوئی اہمیت نہیں دی۔ ''مشین چلی گے کیسے؟'' اب رفیق پُر اعتماد تھا۔ اُس آدمی نے ایک بٹن دبا کر مشین چلا دی اور رفیق نے اُس سے نٹ لے لیا۔ نٹ دیکھ کر اُسے بندوق کی نالی اور اپنے بندر کی لکیریں یاد آ گئیں۔ وہ آدمی باہر جا کے اخبار پڑھنے لگا اور رفیق کبھی مشین کو دیکھتا اور کبھی نٹ کو۔ پھر اُسے مشین کی چال کی سمجھ آنا شروع ہو گئی اور اُس نے نیا نٹ بنانا شروع کر دیا۔ رفیق کو محسوس ہوا کہ اُسے کافی وقت لگا ہے اور جب اُس نے دیوار پر لگی گھڑی پر وقت دیکھا تو صرف پچیس منٹ صَرف ہوئے تھے۔ وہ اُس آدمی کے پاس جا کھڑا ہوا جو اب چائے پی رہا تھا۔ رفیق نے اُسے دونوں نٹ دکھائے۔ اُس نے دونوں نٹ دیکھے، پھر رفیق کو دیکھا اور پھر چائے کا گھونٹ لیا۔

''کاریگر ہو۔'' اُس آدمی کی آواز میں کسی بھی قسم کا تعریفی پہلو نہیں تھا۔ رفیق نے سوچا کہ وہ اُسے کیا بتائے کہ اُسے کہتے ہی رفیق کاریگر ہیں۔ لیکن وہ خاموشی سے اپنی خوشی کو چھپانے کی

کوشش میں رہا۔ ''کہاں رہتے ہو؟'' رفیق اِس تمام گفتگو میں اپنے آپ کو قابو میں رکھے ہوئے تھا۔ یہ آدمی اُسے کچھ ہمدرد، کچھ شناسا سا اور کچھ اِس قسم کا لاتعلق بھی لگا جس کی لاتعلقی میں کوئی نقصان دہ پہلو نہیں ہوتا۔ رفیق نے ایک دم رونا شروع کر دیا۔ اُسے گاؤں سے نکلنے کے بعد سے لے کر اب تک کی ہر ہزیمت، تکلیف، بے عزتی، ٹھوکریں اور محرومی نے اپنے بوجھ تلے دبایا ہوا تھا۔ اُس آدمی نے اُسے رونے دیا۔ رفیق جب رو چکا تو اُس آدمی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی اور رفیق نے شرمندگی سے گردن جھکا لی۔ ''گردن اوپر اُٹھاؤ۔ پشیمانی کی ضرورت نہیں۔ یہ مارکیٹ ہے۔ یہاں کام ڈھونڈو اور گاہک بناؤ۔ مجھے کسی سے درخواست کرنا نہیں آتا۔ جو تم نہیں بنا سکے میں بنا دوں گا۔''

رفیق کے ذہن میں ورک شاپ آئے اور اُس نے وہاں چکر لگانا شروع کر دیے۔ پہلے تو کسی نے اُسے سنجیدگی سے نہیں لیا کیوں کہ وہ مشینیں ایک ہڈ حرام کی تھیں لیکن پھر آہستہ آہستہ رفیق نے اپنی ساکھ بنانا شروع کر دی۔ اُس کے کام میں ایک طرح کی نفاست تھی یا یہی اُن کے گاہک کہتے اور وہ دونوں قہقہہ لگاتے ہوئے آپس میں بات کرتے کہ لوہے کے کام میں نفاست کہاں سے آ گئی؟ رفیق ہمیشہ وقت سے پہلے کام مکمل کرتا۔ اُس کی شہر میں کسی کے ساتھ شناسائی ہی نہیں تھی اور وہ ہر وقت دکان میں کام پر لگا رہتا۔ اُس کے پاس اب کچھ پیسے بھی جمع ہو گئے تھے اور ایک دِن اُس نے گاؤں جانے کا فیصلہ کیا۔ وہ اپنے ماں باپ سے ملنے کے علاوہ وہ پیسے بھی واپس کرنا چاہتا تھا جو اُس کے باپ نے اُسے دیے تھے۔

وہ جس طرح رات کے اندھیرے میں گاؤں سے نکلا تھا، اُسی طرح اپنے گھر گیا۔ اُسے اپنے گھر میں کوئی تبدیلی محسوس نہیں ہوئی۔ وہ چپ چاپ صحن میں کھڑا چاروں طرف دیکھتا رہا۔ یہ کوئی اتنا کھلا صحن نہیں تھا کہ اُس کے تفصیلی جائزے کے لیے دوسری نظر کی ضرورت ہو لیکن وہ خاموش کھڑا ہر دیکھی ہوئی چیز کو بار بار دیکھے جا رہا تھا کہ ماں اُسے پہچان گئی۔ ایک چیخ بلند ہوئی، خوشی میں ڈوبا ایک قہقہہ، غم کی گہرائی سے نکلتی فریاد اور کئی سالوں کی خاموشی میں پلتی ہوئی آہ اُسے اشک بار کر گئی۔ اُس کا خیال تھا کہ وہ اپنے والدین سے ملے گا بالکل جیسے ابھی کل ہی ملا تھا۔ اُس کا اندازہ غلط ثابت ہوا۔ وہ ماں سے گلے مل کے دیر تک روتا رہا اور پھر اُس کے باپ نے اُسے کلاوے میں لے لیا۔ اُس کے باپ کی گرفت مضبوط اور بازوؤں طاقت تھی۔ ماں کھانے کو کچھ لانا

چاہتی تھی۔ باپ نے خوشی اور ایک طرح تکبر کے ساتھ بتایا کہ فقیر حسین کے باپ نے بہت ترقی کر لی تھی، اب وہ گاؤں میں ایک اہم آدمی جانا جاتا تھا اور رفیق کو بھی خوشی ہوئی کیوں کہ فقیر حسین اُس کا لنگوٹیا تھا۔ ماں نے اُسے اطلاع دی کہ گھر میں مختلف گھروں سے آئے ہوئے کئی قسم کے کھانے تھے۔ رفیق نے اُن کھانوں کو کھانے سے انکار کر دیا۔ اُس نے اپنی ماں کو ایک سادہ چپاتی بنانے کو کہا جسے وہ اچار اور پیاز کے ساتھ کھا لے گا۔ کھانا کھاتے ہوئے اچانک اُسے اپنا بندر یاد آ گیا۔ اُس نے سوچا کہ وہ اُسے ساتھ لے جائے گا اور وہاں اپنے فالتو وقت میں اُس کی ترکیب کو بہتر بنانے کی کوشش کیا کرے گا۔ اُس کے باپ نے بتایا کہ بندر تو وہ ڈیرے والوں کو پہنچا آیا تھا کیوں کہ وہ اُس پر مسلسل دباؤ ڈال رہے تھے اور بچت اِسی میں تھی کہ وہ بندر اُن کے حوالے کر دیتا۔ اُسے اچانک اپنا گھر اجنبی لگنے لگا۔ یہاں گاؤں کے مختلف گھروں سے لایا گیا کھانا کھایا جاتا ہے اِس لیے یہاں کسی کی انا ہی نہیں تھی۔ اُس نے طے کر لیا کہ وہ صبح ہوتے ہی یہاں سے نکل جائے گا۔ اُس نے باپ کے پیسے واپس کرنے کے علاوہ اور بھی دیے جو وہ اُس کے لیے لایا تھا۔ لیکن پھر اُسے خیال آیا کہ گاؤں چھوڑ کے شہر میں جا کے قسمت آزمانے کا مشورہ اُس کے باپ نے ہی دیا تھا اور اگر وہ غربت کے دباؤ تلے آ کے بندر ڈیرے پر پہنچا آیا تو یہ اُس نے اپنی بقا کے لیے ہی کیا تھا۔ وہ بھی شہر میں اپنی بقا کے لیے اپنے مالک کو خوش رکھنے کی کوشش میں لگا رہتا ہے یہ جانتے ہوئے بھی کہ اُس کا کام صرف اُسی کی وجہ سے چل رہا ہے۔ اُس نے اپنے فیصلے پر نظر ثانی کی اور صبح دیر سے جانے کا طے کر لیا؛ فقیر حسین کو ملنے کے بعد۔ رفیق رات دیر تک ماں باپ کو شہر میں اپنی زندگی کے بارے میں بتاتا رہا۔ شہر میں جانے کے بعد اُس نے جہاں اپنی کاریگری کو بلند سطح تک پہنچایا وہاں اُس نے باتیں کرنے کے گر بھی سیکھے تھے۔ اُن کے پاس اردگرد کی تمام ورکشاپوں سے مختلف قسم کے کام آتے رہتے تھے اور اُس نے اپنے گاہکوں کو اپنی کاریگری کے علاوہ چرب زبانی سے بھی متاثر رکھنا تھا۔ وہی ہنر اُس کے ماں باپ کی نیند اُڑا کر لے گیا تھا اور وہ سانسیں روکے اُس کی باتوں میں گم تھے۔ انھیں وقت کا احساس ہی نا رہا اور درختوں پر پرندوں نے جب صبح کی آمد کی اطلاع دینا شروع کر دی تو وہ سونے کے لیے اُٹھے۔ رفیق نے تب ہی اپنی ماں کو بتا دیا کہ اُس نے ناشتہ فقیر حسین کے ساتھ کرنا ہے اور پھر وہیں سے شہر کو نکل جانا ہے۔ اُس کے ماں باپ اُداس تو ہوئے لیکن اُنھیں خوشی تھی کہ رفیق اب اتنا کما رہا ہے کہ وہ یہاں گاؤں میں سکون

کی زندگی گزار سکتے ہیں اور اُنھیں گھر گھر جا کے دو وقت کی روٹی کے لیے خدمت نہیں کرنی ہوگی۔ رفیق نے اپنے باپ کو مشورہ دیا کہ وہ اپنا ایک اڈا بنائے اور وہیں سے اپنی روزی کمائے۔ اب لوگوں کی حویلیوں، باکھوں، ڈیروں اور گھروں میں جا کے کام کرنے کی ضرورت نہیں۔

فقیر حسین دکان کھولنے کے بعد ابھی صفائی ہی کر رہا تھا کہ رفیق پہنچ گیا۔ رفیق کو دیکھتے ہی فقیر حسین نے جھاڑو کو وہیں رکھا اور رفیق کو خاموش کھڑا دیکھتا رہا اور پھر ہنستے ہوئے دونوں گلے ملے۔

''نا جانے کی خبر اور نا آنے کی اطلاع۔'' فقیر حسین کی آواز میں خوشی تھی اور شکایت بھی۔

''یاد ہے میں نے ایک بندر بنایا تھا؟'' رفیق نے پوچھا۔ فقیر حسین نے دل چسپی سے دیکھتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔ ''مجھے ایک شام ڈیرے پر بلایا گیا اور حکم ملا کہ میں وہ بندر اُن کے حوالے کر دوں کیوں کہ اُن کے بیٹے نے اُس سے کھیلا کرنا ہے۔ میں اُن کے پاس جاتے ہوئے بندر گھر چھوڑ گیا تھا اور کوئی جواب دیے بغیر واپس گھر چلا گیا۔ ابے نے کہا کہ تم شہر بھاگ جاؤ کیوں کہ میں بندر نہیں دینا چاہتا تھا۔ میں شہر بھاگ گیا اور وہاں چند دنوں کے فاقوں کے بعد کام ملا اور چل بھی گیا۔'' رفیق ہلکا سا ہنسا، ''کام وہی اپنا خاندانی پیشے والا ہے۔ خراد مشین پر ورکشاپوں کے لیے چھوٹے چھوٹے پرزے بناتا اور مرمت کرتا ہوں۔ میرا مالک ایک بادشاہ قسم کا آدمی ہے جو بہت بڑا کاریگر اور انتہا کا لاپرواہ اور کام چور ہے۔ میں نے اُس کا کام مکمل طور پر سنبھالا ہوا ہے اور وہ بیٹھا اخبار پڑھتا، چائے پیتا اور مجھے بھی کام کرنے سے روکنے کی کوشش میں لگا رہتا ہے''۔ وہ دونوں ہاتھ پر ہاتھ مار کے ہنسے۔ اُسی وقت فقیر حسین کا باپ دکان میں داخل ہوا اور بے ترتیبی دیکھ کے اُس نے بُرا منہ بنایا لیکن رفیق کو دیکھتے ہی اُس کے چہرے سے کھچاؤ جاتا رہا۔ رفیق نے جھک کے اپنا سر آگے کی طرف بڑھایا تو اُس نے پیار سے بالوں کو چھوا۔

''تم لوگ گھر جا کے باتیں کرو، میں دکان سنبھالتا ہوں۔''

''میں نے بس ناشتہ کر کے چلے جانا ہے۔ وہاں میرے کام کا حرج ہے۔'' رفیق نے اپنی اہمیت جتانے کی کوشش کی۔ فقیر حسین کے باپ نے کوئی جواب نہیں دیا اور سامان ترتیب سے رکھنے میں مصروف ہو گیا۔ فقیر حسین نے رفیق کو اشارہ کیا اور دونوں گھر چلے گئے۔ فقیر حسین اپنی ماں کو ناشتے کا بتا کے رفیق کے پاس بیٹھ گیا۔

''تم اپنے مالک کا بتا رہے تھے۔''

رفیق اپنے مالک کو یاد کر کے خوش گواری سے مسکرایا۔ ''وہ ایک اچھا آدمی ہے۔ اُس نے مشینیں تب لگائیں تھیں جب کسی کو اتنی عقل ہی نہیں تھی۔ وہ اکثر کہتا ہے کہ اُسے ترقی کرنے کا بہت شوق ہے لیکن محنت کا نہیں۔ وہ بس ایک ہفتے میں اُتنا ہی کام کرتا تھا کہ گزارا چلتا رہے اور وہ گھر میں کچھ کھا سکے اور دفتر میں چائے پیتا رہے۔ میں اب وہاں چودھری ہوں۔'' رفیق ہنسا۔

''پھر تو تو اچھا آدمی نہیں ہے۔'' فقیر حسین نے بھی ہنستے ہوئے کہا۔

''میں وہ چودھری نہیں ہوں جو یہاں ہیں۔ میں تو کاریگری کا چودھری ہوں۔ میں نے ایک شاگرد بھی رکھا ہوا ہے۔ یہاں کا چودھری تو بہت بُرا ہے۔'' رفیق کو اپنا بندر یاد آیا۔ ''میرے شہر چلے جانے کے بعد وہ ابے پر دباؤ ڈالتے رہے کہ بندر اُنھیں دے دیا جائے جو شاید آخرِکار اُسے دینا ہی پڑ گیا۔ مجھے بہت تکلیف ہوئی۔''

فقیر حسین کی ماں پراٹھا، سالن اور چائے رکھ کے چلی گئی۔ ''اِن لوگوں کو سوائے اپنے اور کسی کی پروا نہیں۔ وہ تو بس اپنے لیے ہی زندہ ہیں۔ چودھری، سیٹھ اور کارخانے والے میں کوئی فرق نہیں۔ یہ سب لوٹتے ہیں۔ ہم نے اِنھیں ختم کرنا ہے۔ بندر دیے بغیر شہر چلے جانے سے تم اِس سوچ کا آغاز کر چکے ہو۔ میں بھی اِسی پر عمل کر رہا ہوں۔ سوچو جب وہ مجھے اپنے ڈیرے پر بلاتے ہیں۔ میں جب وہاں جاتا ہوں تو مجھے وہ گلی کے ایک کتے جتنی اہمیت دیتے ہیں۔ اوئے ہٹی والے کے پُتر گھر راشن پہنچا دو پیسوں کی فکر نا کرنا۔ بات کرنے کا یہ طریقہ مجھے پسند نہیں۔ میرا باپ کہتا ہے کہ ہم نے اُس سودے میں سے اپنا منافع لینا ہے۔ ہمیں اُن کی بات سے زیادہ اپنے پیسے کی فکر کرنی چاہیے جو وہ ہمیشہ دیتے ہیں۔ میں یہ کہتا ہوں کہ اُنھیں ایک انسان کی بھی عزت کرنی چاہیے جو وہ نہیں سمجھتا جس طرح تمھارا باپ اُن کے ڈیرے پر بندر پہنچا آیا۔ تم وہاں پیسہ کماؤ اور میں یہاں گاؤں اور اردگرد میں لوگوں کو اپنے احسان تلے لاتا ہوں اپنا مالی نقصان کیے بغیر۔ ہمارے پاس پیسہ ہونا چاہیے جس سے ہم اُن کا مقابلہ کر سکیں۔ میں نے جو اندازہ لگایا ہے اُس کے مطابق انھوں نے ایسے ہی رہنا ہے اور ہم جو اُن کے پچھڑے ہیں، ہم نے آگے بڑھنا ہے۔ سو محنت کرو اور پیسے جمع کرو تا کہ ایک دِن اُنھیں شکست دیں۔ اِن کے خاندان کی ایک شاخ اِن کے برابر کے حصے دار ہیں اور وہ اِن سے بہتر انسان تھے۔ اُن کے مرد اِن لوگوں نے سرکار کے ہاتھوں

مروادیے کیوں کہ وہ عام آدمی کے وفادار تھے۔ اُن کے خاندان والے آج بھوکے ہیں اور انھوں نے اُن کے حصے پر قبضہ کر کے اُنھیں اپنے ٹکروں پر رکھا ہوا ہے۔"

فقیر حسین چپ ہوا تو وہاں ایک خاموشی چھا گئی۔ رفیق، فقیر حسین کی باتوں پر غور کر رہا تھا اور فقیر حسین کو رفیق کے جواب کا انتظار۔ "تمھاری باتوں میں وزن ہے۔" رفیق نے بے یقینی کے ساتھ بات شروع کی۔ اُسے خود بھی اپنی آواز میں اعتماد کی کمی محسوس ہوئی۔ "لیکن سوچنے والی بات یہ ہے کہ کیا یہ ممکن ہو سکے گا یا ہم ایسے کر پائیں گے؟ تمھارا باپ بھی کوئی تبدیلی نہیں چاہتا۔ میں نے اپنے باپ سے کہا ہے کہ گھر گھر ترکھانی پھیری لگانے کے بجائے وہ اپنا اڈا بنائے اور وہاں بیٹھ کے کام کرے۔ میں جانتا ہوں کہ وہ ایسا نہیں کرے گا کیوں کہ اُس کے خیال میں زندہ رہنے کا طریقہ ہی وہی ہے اور تمھارے باپ کی بھی یہی سوچ ہوگی۔"

پھر ایک طویل خاموشی دونوں کے درمیان حایل ہو گئی۔ رفیق نے سوچا: میرا امالک بھی ایسی ہی باتیں کیا کرتا ہے۔ شاید اسی لیے وہ اکیلا بیٹھا اخبار پڑھتا اور چائے پیتا رہتا ہے۔ ایسی سوچ رکھنے والے شاید خود کو اکیلا کر لیتے ہیں یا کوئی اُنھیں پسند نہیں کرتا۔ جو فقیر حسین نے کہا وہ سچ تھا اور جو وہ کرنا چاہتا تھا ناممکن تھا۔ کیا وہ دونوں مل کے اِس ناممکن کو ممکن بنا سکیں گے؟ اُسے خیال آیا کہ ایسا سوچنے اور کسی وقت کوشش کرنے میں حرج ہی کیا ہے؟

"کیا سوچ رہے ہو؟" فقیر حسین نے رفیق کو اپنے خیالات میں سے نکالا۔ فقیر حسین کی آنکھیں دھندلائی ہوئی تھیں۔

"یہی کہ کسی وقت کوشش کرنے میں کوئی حرج نہیں۔" رفیق نے گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے جواب دیا۔

"کوشش نہیں مثبت ارادے سے کرنا ہے۔"

"وہی مطلب ہے۔" رفیق کی آواز میں قطعیت تھی۔ "میں اب چلتا ہوں۔" رفیق جواب کا انتظار کیے بغیر اُٹھ کھڑا ہوا۔

"ہم نے اِن کے ذرائع ختم کرنے ہیں۔ یہ ہر تانگے والے تک سے ایک روپیہ آنے کا اور ایک جانے کا بھتہ لیتے ہیں۔ تم تانگے کا سفر کر کے دیکھ لینا۔" رفیق ہاتھ ملا کے رخصت ہو گیا اور ایک بار پھر اپنے گھر گیا۔ باپ اپنی ترکھانی پھیری پر نکل چکا تھا اور ماں اُداسی میں ڈوبی

چارپائی پر لیٹی ہوئی تھی اور اُسے دیکھتے ہی اُس کے چہرے پر خوشی کھنڈ گئی۔ رفیق کو اپنی ماں کی حالت پر ترس آیا اور غصہ بھی۔ اُس نے نا تو اپنے لیے کچھ کیا تھا اور نا ہی ابے کو کرنے دیا تھا۔ اُن دونوں کی زندگی اسی طرح گزرتے رہنی ہے وہ بدلنے کی جتنی بھی کوشش کرے۔ اُس نے ماں کے چہرے کو ترس میں ڈوبے پیار سے چھوا۔ ماں کے رخسار گیلے تھے۔ وہ آنسو دکھائے بغیر بہا رہی تھی۔ اُس نے بتایا کہ وہ جانے سے پہلے ملنے آیا تھا اور اگلی بار شاید دیر سے آئے لیکن اُنھیں پیسے پہنچتے رہیں گے۔ رفیق نے یہ بھی تاکید کی وہ باپ کو اپنا اڈا بنانے پر مجبور کرے۔ اُس نے سمجھایا کہ شہر میں جن ترکھانوں یا لوہاروں کے اڈے ہیں وہ پھیری والوں سے کہیں زیادہ کما لیتے ہیں۔ ماں شاید اپنے رونے پر اتنا قابو رکھے ہوئے تھی کہ اُسے بات کرنے سے بھی خوف تھا۔ اُس نے صرف اثبات میں سر ہلایا۔ رفیق کی اپنی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے اور وہ خاموشی کے ساتھ باہر نکل گیا۔

فقیر حسین نے ایک تانگے میں اُس کی جگہ رکھوائی ہوئی تھی اور کوچوان رفیق کے ہی انتظار میں تھا۔ ڈیڑھ گھنٹے کا وہ سفر خاصا تکلیف دہ تھا۔ اُسے افسوس ہونے لگا کہ وہ پیدل کیوں نہیں نکل پڑا۔ وہ اپنے باپ کے ساتھ ہمیشہ پیدل جایا کرتا تھا۔ اُس سفر میں وقت ضرور لگتا تھا لیکن بغیر کمانیوں کے تانگے میں جو جھٹکے لگے اُن سے تو بچا رہتا۔ وہ جب شہر میں تانگوں کے اڈے پر اُترا تو اُس کا جسم درد کر رہا تھا اور اُسے شہر کو آنے والوں کی حالت پر ترس آیا۔ اُسے یہ بھی حیرت ہوئی کہ گاؤں کے لوگ کچا راستہ شروع ہونے تک بس میں کیوں سفر نہیں کرتے تھے۔

وہ جب دکان پر پہنچا تو مالک توقع کے خلاف ایک مشین پر کام کر رہا تھا اور شاگرد اُس کے پاس کسی حکم کے انتظار میں کھڑا تھا۔ رفیق کو دیکھتے ہی مالک نے ایک نعرہ بلند کیا اور کام چھوڑ کے سڑک کے کنارے اپنی مخصوص جگہ پر کرسی رکھ کے بیٹھ گیا۔ وہ رفیق کو دیکھ کے مسکرایا۔ رفیق نے اُسے مسکراتے ہوئے کم ہی دیکھا تھا۔ رفیق کو محسوس ہوا کہ مالک کی خوشی اُس کے باپ کی خوشی کے بالکل برعکس تھی۔ اُس کے باپ کی خوشی میں وہ بے ساختگی نہیں تھی جو اُسے مالک نے دکھائی۔ شاید ڈیرے والوں کو اُس کا شہر آنا پسند نہیں آیا تھا۔ شاید وہ چاہتے تھے کہ وہ بھی اپنے باپ کی طرح ترکھانی پھیری لگانی شروع کر دے اور وہ اُسی جگہ پر رہے جہاں اُس کے باپ دادا تھے۔

رفیق مشین پر کھڑا ہو کے اُس کام کو کرنے لگا جو مالک کر رہا تھا اور وہ شاگرد سے ضروری رہبری لیے جا رہا تھا۔ جب اُسے کام کی نوعیت کی سمجھ آ گئی تو وہ پورے انہماک کے ساتھ جُت

گیا۔ اُسے زیادہ دیر نہیں لگی اور اُس نے کام ختم کر لیا۔ اُس وقت تک دو آرڈر مزید مل چکے تھے اور رفیق اُن کے ساتھ معاملات طے کر کے پھر مشینوں پر جھک گیا۔ وہ تمام تر توجہ سے اپنا کام ختم کرنے میں مگن تھا اور مالک لگا تار اُسے کام کرتے ہوئے دیکھے جا رہا تھا۔ رفیق جب فارغ ہوا تو مالک نے اُسے بلا کے اپنے پاس بٹھا لیا اور اُس کے گاؤں، راستے، گھر اور حالات کے بارے میں پوچھنا شروع کر دیا۔ رفیق نے اُسے ڈیرے والوں کے متعلق بھی تفصیل کے ساتھ بتایا تو مالک کو اُن کے رویے پر بالکل حیرت نہیں ہوئی۔ اُس نے بتایا کہ سرمایہ دار چاہے کسی بھی طبقے کا ہو اُس کا یہی رویہ ہوتا ہے۔ مالک دیر تک اُسے مختلف قسم کے نظریات کے بارے میں بتاتا رہا۔ یہ وہ باتیں تھیں جو اُسے فقیر حسین نے بھی نہیں بتائی تھیں اور مالک اُنھیں نہایت سادہ سے طریقے میں سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ جب بھی رفیق فارغ ہوتا تو مالک اُسے اپنے پاس بٹھا کر غریبی اور امارت کے درمیان کی گہری کھائی کے متعلق بتاتا رہتا۔ وہ اُسے بتاتا کہ غریب یہ کھائی پار نہیں کرنا چاہتا کیوں کہ اُس کا خیال ہے کہ اِسے پار نہیں کرنا چاہیے۔ اُس کے خیال میں ایسی ہر کھائی کا موجد خدا ہے اور اِسے پار کرنا ایک گناہ۔ امیر بھی نہیں چاہتا کہ اُس طرف سے کوئی اِس طرف آئے چناں چہ ایک آدھ مہم جو کو روکنے کے لیے اُس نے مناسب جگہوں پر نشانچی بٹھائے ہوئے ہیں جن کا نشانہ اُنھیں کھائی میں گرا دیتا ہے۔ یہ کھائی ایک ایسی رکاوٹ ہے جو گرنے والوں سے بھرتی جا رہی ہے اور ایک دِن لاشوں کے پُل پر سے ایسا حملہ ہو جانا ہے جو کسی نشانچی سے سنبھالا نہیں جانا۔ رفیق ان باتوں کو سنتے ہوئے کھائی کی گہرائی، وہاں گری ہوئی لاشوں کی تعداد اور پل پار کر کے گزرنے والوں کے متعلق سوچتا رہتا۔ مالک کے ساتھ یہ تعلق اُس کی زندگی کا ایک نیا تجربہ تھا۔

رفیق گاؤں بھی چکر لگا آتا۔ اُس نے اپنے باپ کو اپنا اڈا بنانے کے بارے میں کہنا چھوڑ دیا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ اُس کے باپ کو یقین ہے کہ خدا کی اِس بنائی ہوئی کھائی کو پار کرنا ایک گناہ تھا اور اُس کا رزق اُسی ترکھانی پھیری میں ہے جو وہ روز لگاتا تھا۔ رفیق ہر بار کچھ پیسے بھی دے آتا جو اُن کے طور طریقے سے ظاہر ہونا شروع ہو گئے تھے۔ وہ اب اُن لوگوں سے کم ملتے جو کئی سالوں سے اُن کے ساتھ کھائی کے غربت والے کنارے پر چلتے رہے تھے۔ وہ تھے تو کھائی کے اپنے کنارے پر ہی، اُنھیں دوسرے کناروں والوں کا خوف اِسی طرف رکھے ہوئے تھا لیکن

پرانے سنگی ساتھی بھی اب پسند نہیں رہے تھے۔ اُنھیں اُن کا ہر وقت کا شکوہ اور شکائتیں پسند نہیں رہی تھیں۔ اُنھیں فقیر حسین بھی پسند نہیں تھا جو ڈیرے والوں کے لیے کوئی نا کوئی اُلجھن بنائے رکھتا۔

ایک دِن مالک رفیق کو اپنے ساتھ گھر لے گیا۔ رفیق گھر جاتے ہوئے ایک طرح کی خوشی اور اعتماد سے سر اُٹھائے مالک کے برابر چلتا رہا۔ اُسے محسوس ہو رہا تھا کہ مالک کا اُسے اپنے گھر لے جانا ایک کامیابی تھی اور اُسے اپنی کامیابی پر فخر بھی تھا۔ جیسے ہی دروازے پر پہنچے وہ گھر کے اندر داخل ہونے سے خوف زدہ ہو گیا۔ اُسے لگا کہ ابھی وہ اِس قابل نہیں تھا کہ مالک کے گھر میں داخل ہو سکے۔ وہ ایک ملازم تھا اور اُسے ملازم ہی رہنا چاہیے۔ اُسے اپنے صاف لباس سے شرمندگی کا احساس ہونے لگا کیوں کہ مالک اپنے معمول کے کام والے لباس میں تھا جس پر تیل اور گریس کے داغ لگے ہوئے تھے۔ رفیق اب شام کو صاف لباس پہنتا اور دکان سے کچھ فاصلے پر اڈے کے سب سے بڑے ہوٹل پر ہر شام ٹی وی دیکھتا۔ اُس کے لیے یہ آزادی، غلامی سے نجات کا نعرہ تھا۔ گاؤں میں صرف ایک ٹیلی ویژن تھا جسے ڈیرے والوں کی مرضی کے مطابق دیکھا جاتا اور لوگ ٹیلی ویژن دیکھنے کے بدلے میں پورا عرصہ اُن کے کام بھی کرتے رہتے۔ وہ جب مالک کے پیچھے گھر میں داخل ہوا تو اُسے چھوٹا سا صحن اُداس اور ویران لگا۔ ایک طرف چولہا تھا جس سے تھوڑا ہٹ کے ایک عورت پیڑھی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اُس نے دونوں کو داخل ہوتے دیکھا اور وہ اُسی آسن میں بیٹھی رہی جس میں وہ تھی۔ رفیق نے اپنے ذہن میں ایک تصویر دوڑائی تو اُسے ایک مانوسیت کا احساس ہوا۔ مالک بھی کرسی پر اِسی طرح اُداس بیٹھا ہوتا تھا۔ دوسری دیوار کے ساتھ ایک لڑکی جو عمر میں اُس سے کچھ چھوٹی نظر آتی تھی، اُستاد کی طرح ہی کرسی پر بیٹھی تھی۔ اُسے حیرت ہوئی اور اُسے ایک طرح گدگدی کا بھی احساس ہوا اور اُسے اپنی مسکراہٹ دبانا پڑی۔ اُس نے سوچا: پورا خاندان ہی ایک ڈھنگ کا ہے۔ وہ صحن میں سے گزر کر ایک کمرے میں بیٹھ گئے۔ رفیق نے اندازہ لگایا کہ یہ بیٹھک تھی کیوں کہ وہاں چند ڈھیلے بید والی کرسیاں پڑی ہوئی تھیں اور اُس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ بید والی اِن کرسیوں کی مرمت کا کوئی بندوبست کرے گا اور دوسری وجہ وہ دروازہ تھا جو گلی میں کھلتا تھا۔ مالک نے وہ دروازہ کھول دیا۔

"دیکھو کتنی دیر میں چائے آتی ہے۔ میرے نزدیک کسی گھر کے نظام کا چائے کے جلدی یا دیر سے آنے سے پتا چلتا ہے۔ اب انتظار کرتے ہیں۔" مالک نے ہنستے ہوئے کہا۔ رفیق نے کوئی

جواب نہیں دیا اور نا ہی مالک کی بات کو کوئی اہمیت دی کیوں کہ مالک ہمیشہ ایسی ہی باتیں کیا کرتا تھا جو اور نہیں کرتے تھے۔ اُسی وقت صحن والے دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی اور مالک کی بیوی تھال میں چائے کی دو پیالیاں رکھے داخل ہوئی۔

ٹرے کونے میں پڑی میز پر رکھتے ہوئے اُس نے کہا۔ ''پانی؟'' وہ رفیق کی طرف دیکھ رہی تھی اور رفیق اُس کے دیکھنے سے جھینپ گیا تو وہ ہلکا سا مسکرائی۔ ''لاتی ہوں۔'' وہ جب دروازے کی طرف مُڑی تو رفیق اُسے روکنا چاہتا تھا لیکن وہ پتھر بنے اُسے دیکھتا رہا۔ اُسے اچانک گھر میں وہی کشش محسوس ہوئی جو مالک کو دیکھ کے ہوئی تھی۔ یہ گھر جو اُس کا نہیں تھا یک دم اپنا لگنے لگا۔ اِس خیال کے آتے ہی وہ گھبرا گیا اور اُس نے مالک کی طرف دیکھا۔ رفیق کو بھی یہی توقع تھی اور مالک اپنے ہی کسی خیال میں گم سامنے دیوار کو دیکھے جا رہا تھا جس طرح جب وہ گھر میں داخل ہوا تو اُس کی بیوی اور بیٹی اپنے اپنے خیالات میں گم اپنے سامنے دیکھے جا رہی تھیں۔ اُسے گھر کی یہی لاتعلقی اچھی لگی۔ وہ جانتا تھا کہ مالک ایک ہمدرد آدمی ہے اور اُس کا گھر میں بھی ایسا ہی رویہ ہوگا۔ مالک کی بیوی سٹیل کے گلاس میں پانی لائی تو اُسے اپنا گھر یاد آ گیا۔

اب رفیق اکثر مالک کے ساتھ گھر جاتا۔ وہ جب صحن میں داخل ہوتے تو ہمیشہ اُس کی مالک کی بیوی اور بیٹی کے ساتھ نظر ملتی اور اُسے دیکھتی ہوئی آنکھیں بے تاثر ہوتیں۔ وہ سوچتا: وہ مجھی شاید ایسے ہی دیکھتا ہو! ایک دفعہ اُسے مالک کی بیٹی کے ہونٹوں پر نظر نا آنے والی مسکراہٹ نظر آئی۔ رفیق کو یہ شک لگا اور یقین بھی۔ اُس کے ہونٹ ہمیشہ ایک دوسرے کے ساتھ جُڑے ہوتے تھے اور وہ سوچا کرتا تھا کہ کبھی یہ ایک دوسرے سے جدا بھی ہوتے ہوں گے؟ اُس دِن اُسے اُن میں ایک حرکت نظر آئی۔ وہ جتنی دیر وہاں بیٹھا یہ سوچتا رہا کہ اُس نے ہونٹوں کو نظر نا آنے والی مسکراہٹ میں حرکت کرتے دیکھا تھا یا اُسے وہم تھا۔ رفیق کو اچانک خیال آیا کہ وہ ایک مستری ہے اور مستری کا قیافہ کبھی غلط نہیں ہوتا۔

اُسے ایک دم یقین ہو گیا کہ مالک کی بیٹی مسکرائی تھی۔ اُسے لگا کہ ایک مسکراہٹ اُس کے اپنے ہونٹوں پر بھی پھیل گئی ہے۔ اُس نے سوچا: کیا وہ مسکراہٹ تھی یا مسکراہٹ کا عکس؟ اُس شام وہ زیادہ دیر نہیں بیٹھا۔ عموماً وہ رات کا کھانا کھا کے جایا کرتا تھا۔ مالک کے ہاں کھانے سے وہ اُس رات کے ہوٹل کے کھانے کے پیسے بچا لیتا تھا اور یہ بھی اُس کی بچتوں میں سے ایک تھی۔ اُس شام

اچانک اُسے جانے کی جلدی ہوگئی۔ وہ کچھ دیر اکیلے بیٹھ کے اُس مسکراہٹ کے متعلق سوچنا چاہتا تھا۔ وہ جب جانے کے لیے صحن میں گیا تو مالک کی بیٹی اپنی جگہ پر ہی بیٹھی تھی اور رفیق اُسے دیکھ کے مسکرایا۔ لڑکی کے ہونٹوں کے کونے کپکپائے اور پھر وہ مسکرا دی۔ وہ اپنے ہونٹوں پر لڑکی کی مسکراہٹ سجائے اپنے کمرے کی سیڑھیاں چڑھنے لگا تو رُک گیا۔ اُس کا کمرہ دکان کے اوپر تھا جہاں مالک نے کسی متوقع ملازم یا شاگرد کے لیے ڈربہ نما کمرہ بنا رکھا تھا۔ وہ کمرے میں جا کے کیا کرے گا؟ وہ رات گئے دیر تک سڑکوں پر پھرتا رہا اور جب واپس آیا تو ہوٹل بند ہو چکا تھا۔ رات وہ بھوکا ہی سویا۔

رفیق صبح ہوٹل کے چند غسل خانوں میں سے ایک میں نہاتا تھا۔ اُس غسل خانے میں دیوار پر ایک آئینہ لگا ہوا تھا جس میں اوپر والا آدھا دھڑ نظر آتا تھا۔ نہانے سے پہلے اُس نے آئینے میں اپنا عکس دیکھا گو وہ روزانہ غسل کرنے کے بعد بال بنانے کے لیے صرف اپنا چہرہ ہی دیکھا کرتا تھا۔ اب اُس نے اپنا اوپر والا پورا دھڑ دیکھا۔ اُس کی ٹھوڑی پر بال آنا شروع ہو گئے تھے۔ اُسے اپنی گردن بگلے جیسی نظر آئی، اُس میں وہاں باپ کی گردن والی مضبوطی نظر نہیں آئی جو گندم کی بھری ہوئی بوری سہار سکتی تھی۔ اُس نے اپنی چھاتی دیکھی جو اُسے پچکی ہوئی لگی، باپ کی چھاتی کی طرح نہیں جو بھری ہوئی تھی اور جسے دیکھتے ہی اُس کی طاقت کا احساس ہوتا تھا۔ باپ کی چھاتی کالے اور سفید بالوں سے بھری ہوئی تھی اور اُسے اپنی چھاتی کو غور سے دیکھنے سے ہلکے سے روئیں کا احساس ہوتا تھا۔ اُس کی چوچیاں پچکی ہوئی چھاتی پر مردنی سا تاثر دے رہی تھیں جب کہ اُس کے باپ کی چوچیاں اُبھری ہوئی چھاتی پر نمایاں تھیں اور اُن میں نسیں بھی دیکھی جا سکتی تھیں۔ چوچیاں دیکھتے ہوئے اُسے مالک کی بیٹی کی چھاتیاں ذہن میں آ گئیں جو بھری ہوئی اور نمایاں تھیں۔ رفیق کو اُس کے چہرے میں شادابی کی وہ چمک نظر نہیں آئی جو گاؤں کی لڑکیوں میں دیکھتا تھا۔ مالک کی بیٹی کے چہرے پر ایک اُداسی تھی جیسے وہ خوشی سے واقف ہی نا ہو۔ اُسے اُس کی دونوں مسکراہٹوں میں بھی اُداسی محسوس ہونا شروع ہو گئی۔ وہ اُداس کیوں تھی؟ باہر کسی نے دروازہ کھٹکھٹانا شروع کیا تو رفیق کو یاد آیا کہ وہ وہاں کیوں تھا؟

اب رفیق انتظار میں رہتا کہ مالک اُسے گھر ساتھ لے کے نا چلے۔ مالک جب اُسے ساتھ چلنے کی دعوت دیتا تو رفیق کسی کام کا بہانہ بناتا اور کہتا کہ وہ تھوڑی دیر کے بعد پہنچ جائے گا۔ وہ

جلدی سے غسل کرتا، جوڑا تبدیل کرتا اور بال فلمی طریقے سے بنا کے مالک کے گھر پہنچ جاتا۔ اب دونوں کی مسکراہٹ ایک معمول بن گئی تھی۔ مالک کی بیٹی کی مسکراہٹ میں اب کوئی جھجک نہیں تھی، وہ اُسے دیکھتے ہی ایسے مسکراتی جیسے وہ اکٹھے ہی بڑے ہوئے ہوں۔ رفیق اُس کے گھر میں چلنے پھرنے میں ایک اپنایت محسوس کرتا۔ وہ اب بھی اپنی مخصوص جگہ پر اُسی آسن سے بیٹھی ہوتی لیکن اُس کے اُٹھنے یا واپس بیٹھنے میں ایک نخرہ بھی تھا جو وہ اپنے گاؤں کی لڑکیوں میں محسوس نہیں کرتا تھا۔ اِس تمام اپنایت کے باوجود اُس کی مسکراہٹ کی اُداسی بدستور قائم تھی جسے رفیق ختم کرنا چاہتا تھا۔

مالک اب رفیق کو اپنا شاگرد یا ملازم کہنے کے بجائے حصہ دار سمجھتا اور اُسے تنخواہ کے ساتھ کچھ فی صد کی ساجھے داری بھی دیتا۔ رفیق نے شروع میں ہلکا سا احتجاج بھی کیا لیکن پھر اُسے فقیر حسین کی بات یاد آ گئی۔ اُس نے بھی پیسے جمع کرنے تھے تا کہ ایک دِن ڈیرے والوں کو شکست دے سکیں۔ اُس کے باپ نے ابھی تک اُن کی غلامی قبول کی ہوئی تھی اور رفیق نے محسوس کیا کہ جب ترکھان پھیری اُن کی ضروریات پوری کر رہی ہے تو اُسے اُنھیں پیسے بھی کم دینے چاہئیں۔ اُس کی ماں ابھی تک اُن کی عورتوں کے سروں میں تارے میرے کے تیل کی مالش کر کے جوئیں نکالتی تھی اور اُن کے رد کیے ہوئے لباس پہننا اُس کے لیے باعثِ فخر تھا۔ وہ کئی بار سوچتا کہ اُسے ایسے والدین کیوں ملے؟ پھر اُسے خیال آتا کہ والدین کا انتخاب نہیں کیا جا سکتا اور جیسے اُس کا مالک بتاتا رہتا تھا کہ جب شادی ہو جائے تو نا چاہتے ہوئے بھی بچے دنیا میں آ جاتے ہیں اِس لیے اِس میں والدین کا کوئی کمال نہیں۔ وہ بھی شاید ایسے ہی دنیا میں آ گیا ہو گا! اُسے مالک کی باتوں پر بعض اوقات حیرت بھی ہوتی۔ وہ ایسی باتیں کرتا جنھیں وہ بچپن سے غلط سمجھتا آیا تھا لیکن مالک کی دلیل میں ایسا وزن ہوتا کہ اُسے سچ لگنے لگتیں۔

ایک دِن مالک نے رفیق کو بتایا کہ اُس کے آنے سے کام میں بہتری آ گئی تھی۔ جو پیشہ اُسے وراثت میں ملا وہ اُس سے خوش نہیں تھا اور نظام کی اِس غیر قدرتی تقسیم کے خلاف اُس کی بغاوت اُتنا کام کرنے میں ہی تھی کہ وہ زندہ رہ سکے۔ اُس نے بتایا کہ اب اُس کی بیوی نے بچت محفوظ رکھنا شروع کر دی ہے اور شاید وہ جلد ہی بائیسکل خرید لے تا کہ اپنے کسی دوست سے بھی مل آیا کرے۔ مالک اب کام میں اُس کا ہاتھ بھی بٹاتا۔ وہ کہتا کہ جہاں یہ پیشہ اُسے وراثت میں دے

کے اُس کی اہلیت کو سلب کیا گیا ہے وہاں اِس پیشے کی بنیادی ضروریات پوری رکھنا بھی اُس کی ذمے داری تھی چناں چہ......

اب اُن کے درمیان ایک اور رشتہ بھی قائم ہو گیا تھا اور وہ رشتہ تھا دوستی کا۔ مالک اُسے چٹکلے سناتا اور پھر ہاتھ پر ہاتھ مار کے داد وصول کرتا۔ رفیق کو وہ ایک سادہ اور اچھا آدمی لگتا۔ اُسے اپنا باپ یاد آجاتا اور رفیق کو اپنے باپ کی سادگی پر ترس آتا۔ وہ محسوس کرتا کہ اُس کا باپ صرف باپ تھا اور مالک اُس سیری اور باپ کی جگہ پر ہونے کے ساتھ دوست بھی تھا گو اُس نے کبھی کوئی ایسی بات نہیں کہی تھی جو کسی بھی طرح مالک کی شان کے منافی ہو۔ وہ اُسے ہمیشہ مالک ہی کہتا اور کبھی اُس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بات نا کرتا۔ مالک جب کوئی چٹکلا سنارہا ہوتا تو اُس کے قہقہے میں بھی احتیاط ہوتی۔

وہ اب مالک کے گھر اکثر جاتا اور کبھی کبھار رفیق کو بیٹھک میں اکیلے چھوڑ کے کسی کام کے سلسلے میں کسی کمرے میں چلا جاتا۔ جب وہ اکیلا ہوتا تو مالک کی بیوی اور کبھی اُس کی بیٹی چائے لاتیں۔ مالک کی بیوی چائے اُسے تھما کے فوراً واپس چلی جاتی لیکن اُس کی بیٹی کچھ اِس طرح کا انداز اپناتی جو ظاہر کرتا وہ رکنا چاہتی ہے۔ رفیق سوچتا: وہ اُسے کیسے روکے؟ اِن موقعوں پر وہ اُسے دیکھ کے مسکراتا نہیں تھا۔ وہ کمرے میں اُس کی موجودگی سے اپنی اہمیت کو محسوس کرتا تو خوف زدہ بھی رہتا کہ مالک یا اُس کی بیوی نا آجائیں۔ اِس خطرے کے پیشِ نظر وہ ایسے بیٹھ جاتا کہ اُس کا رُخ کسی اور طرف ہوتا۔

ایک دِن مالک کی بیٹی چائے لائی اور حسبِ معمول کمرے میں رکی نہیں تو گئی بھی نہیں۔ اور پھر اُس نے وہ کیا جس کی رفیق کو اُمید نہیں تھی۔ وہ کمرے میں پڑی دوسری کرسی پر بیٹھ گئی اور پھر اُس کی طرف دیکھ کے مسکرائی۔ رفیق جواب میں مسکرانا چاہتا تھا لیکن مسکرا نہیں سکا۔ بیٹی نے پیالی کی طرف اشارہ کیا تو رفیق نے اُٹھا کے پہلا گھونٹ لیا۔

''مالک......؟'' رفیق کو اپنی آواز کی کپکپی پر حیرت ہوئی۔ وہ سوچتا آیا تھا کہ اُس کے ساتھ جب کسی بھی لڑکی کی ملاقات ہوئی اُس نے اُسے غالب نہیں آنے دینا۔ اُسے اپنی یہ سوچ ایک ناپختہ ذہن کی کارستانی لگی۔ وہ اِس لڑکی سے خائف تھا اور شاید ہر لڑکی سے بھی خائف ہو۔ وہ چاہتا تھا کہ لڑکی جتنا جلد وہ وہاں سے اُٹھ جائے اور پھر اُس نے فیصلہ کرلیا کہ لڑکی اگر نہیں اُٹھتی تو چائے

کی پیالی ختم کر کے وہ خود اُٹھ جائے گا۔

''ابا جی اور ماں تھوڑی دیر کے لیے تین گھر چھوڑ کے کسی کی طبعیت کا پتا کرنے گئے ہیں۔'' اُس نے اپنی میٹھی آواز میں جواب دیا۔ رفیق کو محسوس ہوا کہ اب وہ گھر میں اکیلا نہیں۔ مالک، اُس کی بیوی اور جس کی تیمارداری کے لیے وہ گئے ہیں، وہ سب بھی کمرے میں موجود ہیں۔ اِس خیال نے اُس کی ہمت بندھائی۔ اُس نے لڑکی کی طرف دیکھا تو وہ اُس کے سامنے بیٹھی اپنی ہی کسی دنیا میں گم تھی بالکل جس طرح اُس کی ماں اور باپ ہو جاتے ہیں۔

''کب تک آئیں گے؟'' اِس بار رفیق کی آواز میں کپکپی نہیں تھی۔ اُسے اپنے اعتماد پر حیرت بھی ہوئی۔ اُس نے سوچا: کیا وہ چاہتا تھا کہ وہ فوراً آ جائیں اور وہ اِس جنجال سے، جس میں وہ پھنس گیا تھا، نجات حاصل کر لے! وہ تو چاہتا تھا کہ لڑکی یوں ہی سامنے بیٹھے اُس کے ساتھ باتیں کرتی رہے۔ اُس کے ذہن میں خیال آیا کہ کتنے مالکوں کی بیٹیاں اُن کے شاگردوں یا ملازموں کے پاس بیٹھی اُنھیں چائے پیتے دیکھتی ہیں؟ اُسے مالک کے اعتماد سے اپنا آپ اہم بھی محسوس ہوا۔

''کچھ کہہ نہیں سکتی۔ شاید ابھی آ جائیں یا کچھ دیر بعد!'' اُس کی آواز ابھی تک میٹھی تھی۔ رفیق نے سوچا کہ اُس کی اپنی آواز تو یقیناً بھدی ہوگی کیوں کہ چلتی ہوئی مشین کے شور میں اُسے مالک یا شاگرد کے ساتھ بات کرنے کے لیے اونچی آواز میں بولنا پڑتا ہے اور یہ لڑکی کتنے دھیمے لہجے میں بات کر رہی تھی۔ اُس نے سُن رکھا تھا کہ ایسے لہجے اُن لوگوں کے ہوتے ہیں جنھیں کوئی فکر نا ہو۔ کیا اُس کی بے فکری میں اُس کی مہیا کی ہوئی کمائی کا بھی دخل ہے؟ ''تمھیں جلدی ہے؟'' لڑکی کی میٹھی آواز میں ایک تلخی تھی جو اُسے شوشک کی طرح لگی۔ وہ اُسے کیا جواب دے؟ اُسے کیا جلدی ہو سکتی ہے؟ وہ کچھ عرصہ سے اکیلا اِسی لیے آ رہا ہے کہ اسے ایسا موقعہ ہاتھ آئے۔ اب یہ موقعہ جب میسر آ گیا ہے تو اُسے خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ لیکن وہ اُس کے ساتھ کیا بات کرے؟ ''ابا جی بتا رہے تھے کہ تم کافی کاریگر ہو۔'' رفیق کے اندر فوراً اُس مستری نے انگڑائی لی جو گاہکوں کو اپنی کاریگری اور ہنر وری کے ساتھ ساتھ چرب زبانی سے شیشے میں اُتارتا ہے۔ اُس نے اپنے اندر کی اِس نئی ہستی کو کھلا چھوڑ دیا۔

''مالک کی مہربانی ہے اگر وہ ایسا سوچتے ہیں۔ میں تو ایک گاؤں سے اُٹھ کے یہاں آ گیا

اور تقدیر نے مالک کے پاس بھیج دیا۔ اُنھوں نے مجھے تربیت دینے کے ساتھ رہنے کا سہارا بھی دیا اور اعتماد کر کے اپنے گھر لے آیا اور تمھاری ماں جی اور تم سے ملایا۔ یہ اُن کا بڑا پن ہے کہ وہ تمھیں میرے پاس چھوڑ گئے۔ میں اگر کاریگر ہوں تو مالک کی وجہ سے اور اگر گھسیارا ہی ہوں تو اِس کی ذمے داری بھی اُن پر پڑتی ہے۔'' بات ختم کر کے اُس نے لڑکی کی طرف دیکھا۔ وہ توجہ سے اُس کی بات سُن رہی تھی۔ مالک نے ایک بار اُسے سمجھایا تھا کہ جو بھی تمھیں غور سے سن رہا ہو وہ کام تمہیں سے کروائے گا۔ رفیق جان گیا کہ لڑکی پر اُس کی بات اثر کر گئی ہے۔ اُسے محسوس ہوا کہ اب اُس میں اتنا اعتماد آ گیا تھا کہ وہ سامنے بیٹھی لڑکی کی آنکھوں میں دیکھ سکتا تھا۔ لڑکی ایک بار مسکرائی اور پھر نظر جھکا گئی۔ رفیق کو اُس کے نظر جھکانے میں ایک قبولیت، اپنایت، سادگی اور ہوشیاری محسوس ہوئی۔ اُس نے نظر جھکا کے اپنے تمام محسوسات چھپا لیے تھے جب کہ وہ غالباً اُس کی سوچ پڑھ گئی تھی۔ رفیق نے سوچا کہ اب اُسے بھی کوئی بات کرنی چاہیے، وہ تو صرف جواب یا صفائی دیے جا رہا تھا۔ شاید کوئی سوال پوچھنا ہی مرعوبیت کا سبب بنے۔ ''تم کتنا پڑھی ہوئی ہو؟'' لڑکی نے تیکھی نظر سے اُس کی طرف دیکھا۔ رفیق کو اِس ردِعمل کی توقع نہیں تھی۔ اُس نے خاموش رہنا ہی بہتر سمجھا۔ اُسے یہ اپنی جیت بھی لگی۔

''نو تک پڑھا ہے۔'' لڑکی نے نخرے کے ساتھ کہا۔ رفیق جان گیا کہ وہ جیتا نہیں۔ پھر لڑکی خوش دلی سے ہلکا سا ہنسی، ''پھر پڑھائی سے بھاگ گئی۔ اگر کوئی زور دیتا تو شاید دس کر ہی جاتی۔'' پھر لڑکی نے ایک لمبی سانس لی۔ ''کر لی ہوتی تو اچھا ہی ہوتا۔ کیا خیال ہے؟'' رفیق اِس سوال کے لیے تیار نہیں تھا۔ وہ کچھ جھینپ گیا۔

''زیادہ پڑھ کے کیا کرنا تھا؟ گھر ہی سنبھالنے کی ذمے داری پوری کرنی تھی وہ اب بھی کر لوگی۔ میں کم پڑھا ہوں۔ گاؤں میں سکول تو ہے لیکن ڈیرے والے وہاں کسی کو پڑھنے نہیں دیتے۔ بس تین پڑھو اور باقی زندگی پڑھائی کو ترستے رہو۔ ویسے میں اگر زیادہ پڑھ بھی جاتا تو یہی کام کرتا جو کر رہا ہوں۔'' وہ لڑکی کا رنگ پہلے سفید اور پھر گلابی ہوتے نا دیکھ سکا۔ رفیق نے جب اُس کی طرف دیکھا تو وہ سر جھکائے بیٹھی ہوئی تھی اور وُہ اُس کے ہونٹوں پر دزدیدہ سی مسکراہٹ نا دیکھ سکا۔ ''تمھارا نام کیا ہے؟'' اُس نے یک دم پوچھا۔ لڑکی کو ایک جھٹکا محسوس ہوا۔ اُس نے حیرت بھری نظر سے رفیق کو دیکھا۔ رفیق کو اُس حیرانی میں ایک غصہ بھی نظر آیا۔

''تم نہیں جانتے؟'' وہ برہم تھی۔

رفیق نے نفی میں سر ہلایا اور ایک دم مسکرا دیا۔

لڑکی نے نظر نیچی کر کے ایک لمبی سانس لی جیسے اپنا غصہ پی رہی ہو۔ ''عظمت!'' رفیق کو یہ نام عجیب سا لگا۔ اُس نے سوچا کہ گاؤں میں اُسے 'عجو' یا 'عجی' یا 'عظمتے' کہتے۔ وہ ایک دم مسکرا دیا۔

''اچھا نام ہے۔''

''تمھارے گاؤں میں پڑھنے سے کیوں منع کیا جاتا ہے؟'' رفیق کو فقیر حسین اور مالک کی کہی ہوئی سب باتیں یاد آ گئیں۔ وہ عظمت کو ایک لمبی گفتگو بھی سنا سکتا تھا لیکن اُس نے بات مختصر ہی رکھنے کا فیصلہ کیا تا کہ بہت کچھ کہا اور سنا جا سکے۔

''تا کہ ہم لوگ کسی بھی طرح ترقی نا کر سکیں اور ہمیں ہر وقت اُن کی ضرورت رہے اور وہ ہمیں بھیڑ بکریوں کی طرح ہانکتے رہیں۔ میں شہر میں اِس لیے بھی آیا ہوں کہ پیسہ کما سکوں۔ گاؤں میں میرا ایک دوست بھی یہی کر رہا ہے اور ایک دِن ہم اُنھیں اُس مقام پر کر دیں گے جہاں ہم اِس وقت ہیں۔'' اُس کی آواز میں جوش تھا اور وہ ایک ٹک اُس کی طرف دیکھے جا رہی تھی۔ پھر اُس نے اثبات میں سر ہلایا۔

''ابا جی بھی ایسی باتیں کرتے ہیں اور اُن کے دوست بھی۔ اب مجھے تم دونوں کے قریبی تعلق کی وجہ سمجھ آئی ہے۔'' عظمت نے میٹھے لہجے میں کہا۔ رفیق کو خوشی ہوئی کہ اُسے مالک کا ہم خیال سمجھا گیا ہے۔ اُس نے اپنی خوشی چھپانے کے لیے ایک لمبی سانس لی۔ اُسی وقت گلی میں مانوس سی آوازیں سنائی دیں اور عظمت پیالی اُٹھا کے خاموشی کے ساتھ نکل گئی۔ اُس رات بھی رفیق نے کھانا نہیں کھایا اور وہ سڑکوں پر بغیر کسی مقصد کے گھومتا رہا۔ اُسے بازوؤں میں شہہ پر اُڑان بھرنے کے لیے حرکت کرتے ہوئے محسوس ہوتے؛ اُسے لگتا کہ وہ اُڑنا چاہتا ہے لیکن چھاتی میں جگہ تنگ ہونے کی وجہ سے اُس کی اُڑان ممکن نہیں۔ اُس رات اُسے ایک عجیب خواب نظر آیا۔ اُس نے دیکھا کہ مالک دکان کے سامنے اپنی مخصوص جگہ پر خاموش بیٹھا ہوا ہے اور اُس کی کرسی سے خون زمین پر گر رہا ہے۔ اُس کے پاس سے لوگوں کی ایک بھیڑ گزر رہی ہے جو اُسے دیکھتے تو ہیں لیکن رکتے نہیں۔ وہ مشین بند کیے بغیر مالک کے پاس پہنچتا ہے۔ مالک کا حکم تھا کہ مشین کبھی خالی

نہیں چلنی چاہیے لیکن اُس نے پروا نا کی۔ مشین کے خالی چلنے سے مالک کی زندگی زیادہ اہم تھی۔ وہ جب پہنچتا ہے تو مالک کی جان نکل چکی ہوتی ہے اور وہی مجمع اُسے اُٹھائے ہوئے تھا۔ وہ مالک کو خود اُٹھانے کی درخواست کرتا ہے لیکن وہ اُسے لے جاتے ہیں۔ مالک کے تعلق والے لوگ اور گھر والے بے بس کھڑے جانے والوں کو دور جاتے ہوئے دیکھتے جاتے ہیں۔ وہ ہڑبڑا کے اُٹھ بیٹھتا ہے۔ کمرے میں مکمل اندھیرا تھا۔ باہر سے آنے والی روشنی میں اُس کی آنکھیں جب اندھیرے کی عادی ہوتی ہیں تو کونے میں پڑی ہوئی وہ کرسی نظر آتی ہے جس پر مالک کو چھرا مارا گیا تھا۔ وہ سکون سے لیٹ جاتا ہے لیکن اُسے نیند کافی دیر بعد آئی۔

صبح اُس نے غسل خانے میں پھر آئینے کے سامنے کھڑے ہو کے اپنے اوپر والے دھڑ کو دیکھا۔ اُس کی چھاتی ویسی ہی تھی اور چوچیاں بھی۔ ٹھوڑی پر بال کچھ گھنے اور تھوڑے واضح ہو گئے تھے۔ اُس نے اپنی ٹھوڑی پر ہاتھ پھیرا تو نرم نرم بال اُسے محسوس ہوئے اور اُس نے اُنھیں کٹوا دینے کا فیصلہ کر لیا۔ اُسے پھر لگا کہ عظمت تو مکمل عورت بن چکی تھی اور اُس کے جسم میں سے ابھی تک آدمی نکلتا ہوا نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہی سکڑی ہوئی چھاتی اور پچکی ہوئی چوچیاں، بغیر ڈاڑھی کے گال اور بالوں کے بغیر چھاتی۔ اُسے جلدی تھی کہ یہ سب ہو اور وہ عظمت کے سامنے اپنے آپ کو ایک مرد محسوس کرے۔ وہ جانتا تھا کہ اُس کے اندر ایک مردوالی سب خوبیاں تھیں لیکن بظاہر وہ کسی کو مرد نظر نہیں آتا تھا اور اِسی لیے شاید مالک اور اُس کی بیوی کو اُس سے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ کہیں ایسے تو نہیں.....

وہ جب نہا کے نکلا تو نہانے کے لیے جانے سے پہلے سے زیادہ اُلجھن کا شکار تھا۔ مالک ایک اچھا آدمی تھا جو اُس پر اعتماد کرتا تھا۔ اُسے مالک کی بیٹی کے متعلق ایسی باتیں نہیں سوچنی چاہئیں۔ وہ اپنی بیٹی کو ساتھ لے کے جائیں یا اُس کی سپردگی میں چھوڑ کے، یہ اُن کے سوچنے کے انداز پر تھا، اُس کے ذمے ایک وفاداری ڈال دی گئی تھی جو اُس نے نبھانی تھی۔ یہ سوچ کے وہ کئی دِن مالک کے ساتھ اُس کے گھر نہیں گیا۔ مالک جب بھی اُسے ساتھ چلنے کا کہتا وہ ہمیشہ کوئی بہانہ گھڑ لیتا۔ ایک دِن اُس نے جب بہانہ بنا کے مالک کی دعوت رد کی تو رفیق کو اُس کی آنکھوں میں مایوسی نظر آئی اور وہ کچھ کہے بغیر گھر کی طرف چل پڑا۔ رفیق کو مالک کے ایسے جانے سے تکلیف ہوئی اور اُس نے مالک کو بتائے بغیر اُس کے پیچھے گھر جانے کا فیصلہ کر لیا۔ اُس نے تیار ہونے میں

وقت لیا اور جب مالک کے گھر پہنچا تو اندھیرا ہو چکا تھا اور دروازہ کھٹکھٹائے جانے کے جواب میں عظمت آئی اور رفیق کو لگا کہ وہ اُسے دیکھتے ہی کِھل اُٹھی ہے۔ عظمت کی عموماً بے تاثر آنکھوں میں ایک چمک تھی جس کی روشنی رفیق اپنے چہرے پر محسوس کر رہا تھا۔ شاید اُس روشنی کی وجہ سے اُسے پسینہ بھی آ گیا۔ عظمت ہلکے سے ہنسی، اتنا ہلکے سے کہ رفیق کو شک تھا وہ ہنسی ہی نہیں لیکن وہ جانتا تھا کہ وہ ہنسی تھی۔ اب وہاں خاموشی تھی، صحن کے کسی طرف لگے بلب کی زردی مائل کمزور روشنی میں صحن نہایا ہوا تھا اور پیچھے گلی میں اندھیرا اور دونوں زرد اُجالے اور اندھیرے کے بیچ میں پُر اعتماد کھڑے ایک دوسرے کو دیکھتے تھے۔ اُسی وقت عظمت نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ رفیق نے اُس کا نرم اور چھوٹا سا ہاتھ اپنے مستریوں والے کھردرے ہاتھ میں آہستہ سے لے لیا اور کچھ دیر اُس نرم لمس کو اپنے اندر سرایت کرنے دیا۔ پھر رفیق نے وہ ہاتھ اوپر اُٹھا کے چوم لیا۔ عظمت پھر ہلکے سے ہنسی جو رفیق سُن نہیں سکا۔

''پھکے؟'' عظمت کی میٹھی آواز میں ایک بھاری پن تھا۔

''ہاں عظمتے؟'' وہ پھر ہنسی۔ اب کے ہنسی سنائی بھی دی۔

''اب جاؤ۔''

''کیوں؟''

''میاں مٹھو! یہ آنا گنتی میں نہیں آئے گا۔'' رفیق کو اُس کی بات سمجھ میں نہیں آئی۔ وہ پریشان سا خاموش کھڑا رہا۔ اُسی وقت مالک کی بیوی کی آواز آئی:

''عظمت! کون ہے؟''

''گلی میں کھیلتے بچے۔'' ساتھ ہی عظمت نے ہلکا سا دھکا دیا اور رفیق ایک بار پھر ہاتھ چوم کے دکان کی طرف چل پڑا۔ اُس شام وہ پھر سڑکوں پر رات بھیگ جانے تک پھرتا رہا۔ اُسے اب اس سڑ گشت میں مزہ آنے لگا تھا۔ وہ تصورات کے کئی جالے بنتا رہتا اور چلتا جاتا۔ وہ اپنی ہی ایک دنیا تعمیر کر لیتا جس میں عظمت ہوتی اور وہ ہوتا اور وہ مختلف قسم کے دروازوں کے بیچ میں ایک دوسرے کے سامنے کھڑے ہوتے۔ وہ اُسے کچھ کہنا چاہتی تھی جو وہ سننا چاہتا تھا اور وہ بھی کچھ کہنا چاہتا تھا..... اور جب وہ سوچتا کہ کیا کہنا چاہتا تھا تو اُسے محسوس ہوتا کہ جو اُسے کہنا تھا اُس کے ذہن سے نکل گیا ہے۔ اور وہ پھر سے سوچنا شروع کر دیتا۔

رفیق دیر سے سونے کے باوجود صبح چاک و چوبند تھا۔ اتفاق تھا کہ اُس دِن کام بھی معمول سے زیادہ رہا اور اُس کا دماغ اور جسم ایسے تال میل سے کام کرتے رہے کہ اُسے خود حیرت ہوئی۔ دوپہر کے بعد اچانک اُس نے سوچا کہ اگر وہ عظمت سے نا ملا تو کیا وہ اپنی شام سکون سے گزار سکے گا؟ اِس خیال نے اُسے کسی حد تک خوف زدہ کر دیا۔ اِس خوف میں اُداسی بھی شامل تھی۔ عظمت کی آواز کا مٹھاس میں ڈوبا بھاری پن اُسے تنگ کیے جا رہا تھا اور شاید اِس سے بچنے کے لیے اُس نے دل جمعی سے کام کیا کہ اُس کی تمام تر توجہ مشینوں پر رہے اور وہ گاہکوں سے پیسے بھی وصول کرتا رہا۔

اُس نے صبح گاؤں جانے کا فیصلہ کر لیا۔ اُس کا یہ فیصلہ اتنا اچانک تھا کہ اُسے خود بھی حیرت ہوئی۔ اُس نے کبھی نتائج کے بارے میں سوچے بغیر کوئی فیصلہ نہیں کیا تھا۔ رفیق نے سوچا کہ چند دِن گاؤں میں رہ کے شاید اُس کی چاہت کی شدت میں کچھ کمی آ جائے یا یہ دوری عظمت پر اپنا سایہ ایسے ڈالے کہ وہ بھی وقتی طور پر اُسے بھول جائے۔ رفیق نے سوچا کہ کیا وہ اُسے مستقل طور پر بھول سکتا ہے؟ اُس کے اندر کے چھپے ہوئے آدمی نے کہا کہ ایسے آدمی کو سامنے لایا جائے جو محبت کے سب پہلوؤں سے واقفیت رکھتا ہو۔ اِس خیال نے اُس کے گاؤں جانے کے فیصلے کو تقویت دی۔ شام پھر وہ شہر کے مٹر گشت پر نکلا رہا۔ وہ ایک بار مالک کے گھر کے سامنے رکا بھی لیکن دروازہ کھٹکھٹانے کی اُس میں ہمت نا ہوئی۔ وہ کچھ دیر وہاں کھڑا اُس بند دروازے کو دیکھتا رہا جہاں اُس نے عظمت کا ہاتھ چوما تھا۔ اُس نے ایک لمبی سانس لی اور واپس اپنے مٹر گشت پر چل نکلا۔ وہ رات جب سویا تو اُس نے پھر وہی خواب دیکھا۔ اِس بار خواب کے دوران میں ہی وہ پریشان ہوا کہ مالک کی کرسی کے نیچے خون کی چھپڑی کیوں بنی ہوئی ہے؟ کیا کسی نے اُسے چھرا گھونپ دیا ہے؟ جہاں تک اُس کے علم میں تھا کوئی بھی ایسا آدمی نہیں تھا جو مالک کے چھرا گھونپ دیتا۔ وہ کبھی کبھار مذہبی آدمیوں کے ساتھ بحث ضرور کرتا کہ مذہب کے نظریے میں صحیح مذہب کا تو ذہ پیروکار تھا جب کہ وہ سنی سنائی باتیں کرتے تھے اور اپنی دلیل میں وہ ایسی مثالیں دیتا جو اُس کی سمجھ سے باہر ہوتیں۔ لیکن اُن سب لوگوں کے ساتھ مالک کے اچھے تعلقات تھے اور اُن سب کو وہ پسند تھا۔ وہ خواب دیکھتے ہوئے جاگنے کی کیفیت میں تھا۔ خواب چلے جا رہا تھا اور وہ بیداری میں سوچے بھی جا رہا تھا۔ اُسے اچانک خیال آیا کہ مالک کا دشمن تو وہ تھا جو اُس کی بیٹی کے ساتھ ایسی

ڈنگیں بڑھا رہا تھا اور اُسی نے چھرا گھونپا۔ جب اُسے یہ احساس ہوا تب خواب ختم ہو چکا تھا اور لاتعلق بھیڑ ایک شدید اُنسیت کے ساتھ اُس کی لاش کو اُٹھا کے ایک طرف کو چل پڑی تھی۔ وہ چٹائی پر لیٹا خواب کے انجام اور اپنی سوچ میں پنہاں سچ پر غور کرتا رہا۔

اُسے گاؤں جانے میں ہی اپنی عافیت نظر آئی۔

رفیق مالک کے انتظار میں رہا اور اُس کے آتے ہی گاؤں کو چل پڑا۔ مالک نے ہمیشہ کی طرح اُس کے جانے کی وجہ نہیں پوچھی اور نا ہی رفیق نے بتائی۔ تانگے کے سفر کے بعد سے وہ ہمیشہ کئی میلوں کا سفر پیدل ہی طے کرتا تھا۔ وہ جب گاؤں پہنچا تو دِن ڈھل چکا تھا، شام ہونے کو تھی اور گاؤں کی بوسیدگی میں اُسے تبدیلی نظر نہیں آئی۔ یہ تبدیلی نظر نا آنا شاید زندگی کی یکسانیت ہی تھی اور اس کے باوجود زندگی کی یکسانیت نے کسی حد تک مالی آسودگی دے دی تھی، اب گھر کا کچا صحن پکا ہو گیا تھا اور وہ محسوس کرتا کہ ماں کے چلنے کی رفتار میں بھی تیزی آ گئی تھی۔ اب وہ ہموار سطح پر کسی پرندے کی طرح اُڑتی ہوئی محسوس ہوتی۔ اُس کا باپ صحن اور دوسری متعدد چھوٹی چھوٹی تبدیلیوں سے مطمئن نہیں تھا۔ وہ کہتا کہ کچے فرش، پرانے وضع کے چولھے اور کنویں کا پانی ہی بہتر تھا اور جو آسودگی باہر کے جنگل پانی سے حاصل ہوتی تھی وہ گھر کے اندر کے غسل خانے میں نہیں تھی۔ وہ اپنے آپ کو گھر میں قید محسوس کرتا اور زیادہ وقت بیٹھکوں، حویلیوں اور ڈیرے پر خدمت کرتے، باتیں سنتے اور ڈانٹیں کھاتے گزارتا۔ اُسے رفیق کے باغیانہ رویے کی نا تو سمجھ آتی اور نا ہی وہ اِسے پسند کرتا۔ اُس کا خیال تھا جو دنیا کے نظام میں ایک بار برتر ہو گیا اُسے ہمیشہ اُسی منصب پر رہنے کا حق ہے۔

رفیق جب ایک یا دو راتوں کے لیے گھر آتا تو اُسے گھر کے چھوٹے چھوٹے مسائل میں دل چسپی ہوتی۔ وہ کچھ نا کچھ درست کرتا رہتا۔ اُسے محسوس ہوتا کہ قدرت نے اُسے ایسے کاموں کے لیے ہی بنایا ہے۔ گھر کی ایسی تبدیلیاں جو کبھی کسی کی نظر میں ہی نہیں تھیں، وہ لاتا رہتا اور اُسے سکون بھی حاصل ہوتا کہ وہ اپنے گھر کو گاؤں کے بہت سارے گھروں سے بہتر کیے جا رہا تھا۔ وہ یہ بھی سوچتا کہ گاؤں میں اُس کا مستقبل نہیں تھا۔ وہ طے کر چکا تھا کہ کسی مرحلے پر اُسے شہر منتقل ہو جانا ہے۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اُس کے ایسے ہر منصوبے میں اُس کے والدین رکاوٹ ہوں گے۔ وہ تو کھلی فضاؤں میں اڑانیں بھرتے پرندوں کی طرح تھے اور شہر لے جانا اُنھیں پنجرے میں بند

کر کے اُن کی آزادی سے محروم کر دیتا تھا۔

اِس بار وہ گھر آیا تو خاموش تھا، اُس کی ماں نے محسوس کیا کہ اُس کے ماتھے پر ہر وقت سلوٹیں اُبھری رہتیں اور کوئی سوچ مسلسل اُسے پکڑے ہوئے تھی۔ وہ جاننا چاہتی تھی اور نہیں بھی جاننا چاہتی تھی۔ اُسے اب رفیق کی باتوں کی سمجھ نہیں رہی تھی۔ وہ اب ایسی باتیں کرتا تھا جو اُس نے گاؤں میں کسی کو کرتے ہوئے نہیں سنا تھا۔ وہ ایسی سوچوں کو رفیق کا پاگل پن بھی سمجھتی لیکن اب وہ چاہتی تھی کہ وہ باتیں کرے خواہ وہ اُس کی سمجھ میں نا ہی آئیں۔ رفیق چارپائی پر بیٹھا سامنے دیوار کو دیکھے جا رہا تھا اور کبھی کبھار وہ مسکرا بھی اُٹھتا۔

پہلی رات تو وہ آرام سے سویا رہا۔ ایک گہری اور بھاری تھکاوٹ بھی اُس کے ذہن اور بدن کو اپنے نیچے دبائے ہوئے تھی۔ اگلی رات پھر اُسے وہی خواب نظر آیا۔ جب خواب کا آغاز ہوا تو اُس نے چاہا کہ خواب کی جگہ تبدیل ہو جائے۔ وہ شاید اُس رات وہ خواب اپنے گھر، گلی اور گاؤں کے پسِ منظر میں دیکھنا چاہتا تھا لیکن اُسے مالک کو اپنی مخصوص کرسی پر مخصوص جگہ پر بیٹھے دیکھ کر مایوسی ہوئی۔ باقی خواب وہی تھا جو وہ دیکھ چکا تھا۔

وہ صبح اُٹھا تو کچھ پریشان تھا۔ اُسے اچانک عظمت کی یاد نے گھیر لیا۔ وہ اُس سے ملا تو اتنا نہیں تھا لیکن یہ احساس ضرور تھا کہ جب چاہتا اُسے دیکھ سکتا تھا۔ اگر مالک کی مرضی کا وہ تابع ہوتا تو روزانہ اُس کے ساتھ جا سکتا تھا اور اکیلے جانے میں اُسے اب ایک جھجک تھی۔ عظمت نے اُسے پیار سے دھکیل دیا تھا کہ روزانہ بھی مناسب نہیں۔ کیا وہ بھی اُسے یاد کرتی ہوگی یا اپنے باپ کی طرح اپنی مخصوص جگہ پر لاتعلق سی بیٹھی خالی نظروں سے سامنے دیکھتی ہوگی۔ رفیق کو اچانک اُس کے بے آواز قہقہے یاد آ گئے۔ اُس نے اُسی وقت فیصلہ کر لیا کہ وہ شہر نہیں جائے گا۔ یہ فیصلہ کرتے ہی اُس نے خود کو ہلکا محسوس کیا۔ اُسے لگا کہ شاید اُس کی زندگی کا یہ اُتنا ہی بڑا فیصلہ تھا جتنا بندر ڈیرے والوں کا نا دے کر شہر جانے کا۔ تب وہ اُن سے خوف زدہ ہو کے شہر جا چھپا تھا اور اب عظمت سے خائف ہو کے وہ گاؤں میں چھپنا چاہتا تھا۔ اچانک اُس نے محسوس کیا کہ وہ بزدل ہے۔ اگر وہ بزدل نا ہوتا تو ڈیرے والوں کو بندر دینے سے انکار کر دیتا اور اُس انکار کے جو بھی نتائج ہوتے اُنھیں مردانہ وار بھگتتا؛ اِسی طرح وہ عظمت سے چھپ کے یہاں گاؤں میں پناہ لینے آ گیا تھا جب کہ اُس کا رفیق پر کسی قسم کا دباؤ نہیں تھا۔ کیا وہ اپنے والدین کی طرح اُسی راہ پر

چل رہا ہے جہاں اُسے کوئی خطرہ نہیں۔ عظمت اُسے معصوم لگی جو اُس کی طرف ہاتھ بڑھا رہی تھی۔ اُسے ڈرنے کی ضرورت نہیں، صرف اِس دروازے میں کھڑے ہو کے عظمت کے بڑھے ہوئے ہاتھ کو تھامنا تھا۔ اُسے اچانک اپنا شہر نا جانے کا فیصلہ احمقانہ لگا اور اُس نے اُسی وقت اپنا فیصلہ تبدیل کر لیا۔

رفیق جب اِس کشمکش میں سے گزر رہا تھا تو اُس وقت اُس کا باپ اپنے معمول کی پھیری پر نکل چکا تھا اور ماں بھی انتظار میں تھی کہ رفیق کچھ کھالے تا کہ وہ بھی اپنے فرائض پورے کرنے کے لیے گھر سے نکل جائے۔ رفیق نے سوچا کہ وہ اُسی وقت نکل پڑے گا اور شہر میں رات اپنے کمرے میں آرام کرنے کے بعد اگلے دِن کی ہر سختی کو برداشت کر جائے گا۔ اُس نے ماں کو آواز دی اور جو پیسے وہ گھر کے لیے لایا تھا ایک مسکراہٹ کے ساتھ اُن کے ہاتھ پر رکھ دیے۔ اُسے اپنی مسکراہٹ کے جعلی پن پر حیرت ہوئی۔ وہ اب جانے کے لیے تیار تھا اور ماں کو بتایا کہ اب اُسے چلنا چاہیے اور جواب کو انتظار کیے بغیر چل پڑا۔ اُس نے پیچھے مُڑ کے دیکھا تو ماں مٹھی کھول کے نوٹ گن رہی تھی۔

رفیق اپنی ماں کو ہر پھیرے پر اتنے پیسے دیتا کہ اگلے چکر تک اُنھیں ضرورت کے وقت تنگی نا ہو اور باقی رقم وہ سنبھالتا جاتا جو اب خاصی ہو گئی تھی۔ وہ اُن پیسوں کو کہیں ایسی جگہ لگانا چاہتا تھا جو اُس کے کام آتے رہیں۔ اُس کے ذہن میں کئی منصوبے تھے جن میں مالک جیسی مشین لگانا بھی شامل تھا اور وہ یہ بھی جانتا تھا کہ وہ کاریگری والا جو بھی کام کرے، اُس میں اِتنی صلاحیت تھی کہ کامیاب ہو جائے گا۔ اُس نے اپنے پیسوں کو صرف محفوظ رکھنا ہے۔ وہ جب شہر پہنچا تو شام ہو چکی تھی۔ اُسے شہر کچھ تنگ، گھٹا گھٹا اور دبا دبا لگا۔ اُس نے سوچا کہ یہی شہر اِس وقت اُسے اُمیدوں کی روشنی سے چمکتا ہوا لگا کرتا تھا۔ کیا وہ اتنا اُداس تھا کہ شہر کا مزاج ہی بدلا ہوا نظر آیا۔ وہ منہ ہاتھ دھوئے بغیر مالک کے گھر کی طرف چل پڑا۔ ہمیشہ کی طرح اُس کے گھر کا دروازہ بھیڑا ہوا تھا اور اُس میں کہیں کوئی درز تک نہیں تھی۔ رفیق اپنے مشاہدے پر مسکرا دیا کہ یہ ایک مستری کا دروازہ تھا اور اِس میں کان نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ گھر کے سامنے، جہاں اندھیرے کا ایک چھوٹا سا جزیرہ تھا، کھڑا ہو گیا کہ ممکن ہے عظمت اُس کے انتظار کی بے چینی میں دروازہ کھولے اور وہ ایک جھلک دیکھ سکے۔ اُسے وہاں کھڑے ہونا بھی قابلِ اعتراض لگ رہا تھا۔ وہاں سے مالک کے کہیں باہر سے

واپس گھر آنے کو ناممکن قرار نہیں دیا جا سکتا تھا کیوں کہ وہ بعض اوقات اپنے مخالف دوستوں کے ساتھ بحث کرنے جاتا رہتا ہے۔ رفیق کو یہ بھی خیال آیا کہ مالک کو ایسی سر کھپائی سے کیا حاصل ہوتا تھا؟ وہ جانتا تھا کہ گلی میں رہنے والے لوگ ایک دوسرے کو طویل عرصے سے جانتے تھے اور کسی اجنبی کو اِس طرح مختصر سے اندھیرے میں اپنے آپ کو چھپانا کسی شک کو جنم دے سکتا ہے۔ وہ پریشانی کے ساتھ کچھ خوف زدہ بھی ہوا۔ اُس نے وہاں سے ہٹ جانے میں ہی دانش مندی جانی اور اپنے معمول کے مٹرگشت پر نکل پڑا۔ وہ جب کمرے میں پہنچا تو تھکاوٹ اُس پر بھاری آ چکی تھی۔ سونے سے پہلے اُس نے ہوٹل کے کیشیئر سے اپنے پیسے واپس لینے کا فیصلہ کیا۔ وہاں قانون یہ بنایا گیا تھا کہ پیسے واپس لینے کی بارہ گھنٹے پہلے اطلاع کرنا ضروری ہے۔ ہوٹل والے پیسے سنبھالنے کی تھوڑی سی کٹوتی کرتے تھے جو ہر کسی کو قابلِ قبول تھی؛ اڈے اور ارد گرد ایسے کام کرنے والے لڑکے جو گھروں سے دور تھے اپنے پیسے بطور امانت وہاں جمع کرواتے رہتے تھے اور ہوٹل والے جنھیں اپنے استعمال میں لاتے۔ رفیق جانتا تھا کہ تھوڑی سی بحث کے بعد اُسے پیسے مل جائیں گے۔

رفیق نے سونے سے پہلے ارادہ کیا کہ وہ رات کو خواب نہیں دیکھے گا اور جیسے ہی خواب شروع ہوا وہ اُٹھ کے بیٹھ جائے گا: وہ اپنے اُن خوابوں میں بھی ایسے ہی کرتا تھا جو اُسے گیلا کر جاتے تھے۔ وہ مالک کے قتل کے خواب دیکھنے سے اُکتا چکنے کے ساتھ خوف زدہ بھی ہو گیا تھا۔ اُسے پریشانی تھی کہ اُس کے خوابوں میں مالک ہی ہمیشہ قتل کیوں ہوتا ہے؟ رفیق کو یہ بھی خیال آتا کہ وہ مالک کو قتل ہوتے اِس لیے دیکھتا تھا کہ اُس کی کسی اور کے ساتھ شناسائی نہیں تھی۔ رات وہ اتنا چوکنا ہو کے سویا کہ اُسے خواب نہیں آیا۔ نیم بیداری اور نیم خوابی کی کیفیت میں رہنے کی وجہ سے وہ صبح جب اُٹھا تو کچھ تھکا تھکا اور سست سست تھا۔ ارد گرد خبر پہنچ گئی تھی کہ رفیق کام پر موجود ہے اور کام کروانے والوں کا تانتا بندھ گیا۔ وہ سہ پہر تک اتنا مصروف رہا کہ اُسے پتا ہی نا چل سکا کہ مالک نہیں آیا تھا۔ مالک کا نا آنا کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی، وہ اُس کے وہاں کام کرنے کے عرصے میں دو یا تین بار نہیں آیا تھا اور اُس کی غیر حاضری معمول بھی نہیں تھا اِس لیے رفیق کو کچھ اُلجھن بھی ہوئی کیوں کہ مالک کی موجودگی اُس کے لیے ایک طاقت کی علامت تھی۔ سہ پہر کے بعد کام کی رفتار سست پڑ گئی اور عظمت کی یاد اُس کے اندر انگڑائی لے کے اُٹھ بیٹھی۔ یاد تھی ہی کتنی

لیکن پھر بھی ایک ذخیرہ تھا: بیٹھک میں تفتیشی قسم کی گفتگو اور دروازے میں کھڑے مختصر وقت میں ایک طویل اظہارِ محبت!

رفیق کو یک دم خیال آیا کہ مالک کا نا آنا شاید اُس کے حق میں تھا۔ اب وہ شام کو اُسے دِن بھر کی کمائی دے کے اپنی کارکردگی دکھانے کے علاوہ عظمت کو بھی دیکھ لے گا اور اگر وہ دروازہ بھیڑنے آئے تو کچھ بات چیت بھی ممکن ہو سکے گی۔ اُسے خیال قابلِ عمل لگا اور معمول سے تھوڑا پہلے دکان بند کر کے وہ نہانے چلا گیا۔ ہوٹل والوں نے سٹاف کے لیے جو غسل خانہ رکھا ہوتا تھا اور بعض اوقات اُس کی چابی نہیں ملتی کیوں کہ چابی والا کسی کام پر نکلا ہوتا تھا۔ اُس دِن قسمت نے اُس کا ساتھ دیا اور چابی والا موجود تھا۔ رفیق نے احتیاط کے ساتھ غسل کر کے لباس تبدیل کیا اور اپنے بالوں کو ایسے بنایا کہ ایک لٹ ماتھے پر رقص کرتی نظر آئے۔ اُس نے پیسے گنے جو دو ہزار کے قریب تھے اور اُسے خوشی ہوئی کہ وہ مالک کو اُس کی غیر حاضری میں بھی جیب بھر کے دے رہا تھا۔

مالک کے گھر کے اندر حسبِ معمول خاموشی تھی۔ رفیق کے دستک دینے کے کچھ دیر بعد اُسے صحن میں قدموں کی آواز سنائی دی اور اُسے آنے والا تھکا ہوا محسوس ہوا اِس لیے رفیق نے اندازہ لگایا کہ یہ عظمت نہیں تھی۔ دروازہ مالک کی بیوی نے کھولا۔ وہ روئی ہوئی لگ رہی تھی۔ رفیق کو اپنا دِل تیزی کے ساتھ دھڑکتے محسوس ہوا۔ اُسے ایک دم عظمت کی فکر لاحق ہوگئی۔ اُس نے صحن اور کمروں کی طرف جلدی کے ساتھ دیکھا۔ وہ کہیں نظر نہیں آئی، صرف درمیان والے کمرے میں سے پریشان سی دبی دبی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ اب اُس کی تمام تر توجہ اُس کمرے کی طرف تھی۔ مالک کی بیوی بے دلی کے ساتھ درمیان والے کمرے کی طرف جا رہی تھی اور رفیق تھکاوٹ سے بھاری قدموں کے ساتھ اُس کے پیچھے تھا۔ اُسے ایسے لگ رہا تھا کہ اُس کا گاؤں سے شہر کا سفر ابھی ختم نہیں ہوا اور ابھی چند گھنٹوں کی مسافت باقی تھی۔ مالک کی بیوی نے دروازے کے سامنے رُک کے اُسے اندر جانے کا اشارہ کیا۔ رفیق کے اندر کی کسی گہرائی میں سے جھجک اور خوف جاتے رہے اور ایک تجسس نے اُسے اپنی گرفت میں لے لیا۔ مالک کی بیوی کی آنکھیں رونے سے سُرخ کیوں تھیں؟ کمرے میں سے دبی دبی، پریشان سی آوازیں کیوں آ رہی تھیں؟ وہ ایک گھبراہٹ کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا۔ دروازے کے چوکھٹے میں سے گزرتے ہوئے

اُسے اپنے آپ پر غصہ بھی آیا کہ وہ اچانک اتنا گھبرا کیوں گیا تھا؟ اُس نے کمرے میں داخل ہو کے سامنے دیکھا جہاں نواڑی پلنگ پر مالک لیٹا ہوا تھا۔ اُسے مالک کا جسم بے جان لگا۔ رفیق کو محسوس ہوا کہ مالک ساری زندگی پرزے بناتا رہا تھا اور اب اُس کا اِس طرح بے جان ہونا اُسے مالک کی زندگی کے نظریے کی نفی لگا۔ اُسے یاد آیا کہ مالک زندگی کے ہمیشہ جاری رہنے والے سلسلے میں یقین رکھتا تھا اور یہی اُس کی اپنے مخالف دوستوں کے ساتھ بحث رہتی تھی۔ اُسے شک گزرا کہ مالک فوت ہو گیا ہے۔ اُسے افسوس اور دکھ ہوا کہ اِس احساس نے اُسے کسی صدمے سے دوچار نہیں کیا۔ رفیق کے ذہن میں مالک کی مشینیں آئیں جنھیں وہ اب اپنے طریقے سے چلائے گا اور اُس کی بیوی کو جائز حق کی ترسیل اُس کی ذمے داری ہوگی۔ رفیق نے اب ایک خوف کے ساتھ مالک کی طرف دیکھا۔ وہ ٹکٹکی لگائے چھت کو دیکھ رہا تھا اور وہ اپنے اردگرد سے بے خبر تھا۔ رفیق کو لگا کہ کسی نے اُس کے دِل پر زور کا گھونسا مار دیا ہے اور اُس ضرب کا درد اتنا شدید تھا کہ اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ ایسے آنسو تھے جو روکے جانے کے باوجود رُک نہیں رہے تھے۔ وہ روئے جا رہا تھا اور اُس کی تکلیف میں شدت ہوئے جا رہی تھی۔ کسی نے اُسے روکا نہیں اور نا ہی دلاسا دیا۔ اُسے حیرت ہوئی کہ کیا وہ اجنبیوں کے درمیان میں اپنے کسی نہایت قریبی ساتھی کی محرومی پر آنسو بہا رہا تھا؟ اچانک ایک شرمساری نے رفیق کے آنسو خشک کر دیے۔ کمرے میں دو عورتیں اور دو ہی مرد تھے۔ ایک کم عمر والا آدمی لاتعلقی اور عدم دل چسپی کے ساتھ صحن کی طرف دیکھ رہا تھا جب کہ دونوں عورتیں اور مالک کی عمر کے آدمی کے اُس کی طرف دیکھنے میں جارحیت تھی۔ رفیق کو اچانک ڈیرے والے یاد آ گئے اور اُس کے بدن میں خوف کی جھرجھری دوڑ گئی۔ یہ لوگ کون تھے اور کیا چاہتے تھے؟ مالک چھت کو کیوں دیکھے جا رہا تھا؟ وہ خود اِس طرح ٹوٹ کے کیوں رویا؟ اُسی وقت اُسے ایک کونے میں عظمت بیٹھی نظر آئی۔ رفیق نے دیکھا کہ اُس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں اور اُس کے بے تاثر چہرے پر دکھ کے گہرے سائے تھے۔ اُسے محسوس ہوا کہ اُس چھوٹے سے مجمع میں عظمت واحد ہستی تھی جسے مالک کا دکھ تھا۔

رفیق نے مالک کو پھر دیکھا۔ وہ اُسی طرح چھت کو دیکھے جا رہا تھا۔ اُسے کچھ سمجھ آ گئی اور کچھ وہ جاننا چاہتا تھا۔ اُس نے ایک نظر عظمت کو دیکھا جو اُسے دیکھ رہی تھی، پھر اُس نے مالک کی طرف دیکھا جیسے وہ عظمت کی طرف اِس طرح دیکھنے کی معذرت چاہ رہا ہو۔ عظمت نے ایک لمبی

سانس لی۔ ''اباجی کو آپ کی فکر تھی۔ وہ کہہ رہے تھے کہ آپ کو اپنے مستقبل کے بارے میں سوچنا چاہیے کہ اُن پر فالج کا حملہ ہو گیا۔ یہ کوئی نہیں بتا سکتا تھا کہ اُنھیں کیا فکر تھی اور وہ کیوں پریشان تھے؟'' عظمت خاموش ہو گئی۔ رفیق کا خیال تھا کہ وہ اپنے آپ کو دِل گرفتہ ثابت نا کرے کیوں کہ اُس کا یہاں عظمت کے علاوہ لاتعلق لوگوں کے درمیان میں بیٹھے ہونا اُسے پہلے ہی دوسروں سے الگ کیے ہوئے تھا۔ وہ جس آسودگی کے ساتھ مالک کے زیرِ سایہ زندگی گزارتا رہا تھا اب اختتام پذیر ہوتی محسوس ہوئی۔ وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ اُس کی جیب میں پیسے اور دکان کی چابی تھی۔ وہ چابی ہمیشہ اپنے پاس رکھتا تھا۔ اُس نے جھک کے مالک کے پاؤں چھوئے اور باہر نکل آیا۔ رفیق کو محسوس ہوا کہ وہ اچانک بے سہارا ہو گیا ہے۔ مالک نے کبھی ظاہر کیے بغیر اُس کے سر پر اپنی عنایت کا سائبان کر رکھا تھا۔ وہ صحن میں کچھ دیر رکا۔ اُسے محسوس ہوا کہ وہ کسی کا منتظر ہے۔ پھر اُس نے سوچا کہ اُسے کس کا انتظار ہو سکتا تھا؟ مالک اپنے پلنگ پر کسی ناکارہ پرزے کی طرح بے مصرف پڑا ہوا تھا، عظمت اپنے باپ کے دکھ میں بے حال نظر آئی اور مالک کی بیوی روئی ہوئی ضرور تھی لیکن پریشان نہیں لگ رہی تھی۔ رفیق کو اپنے اِس خیال پر حیرت بھی ہوئی۔ اُسی وقت مالک کی بیوی اور عظمت کمرے سے نکل کے صحن میں آ گئیں۔ کچھ دیر تینوں خاموش کھڑے رہے۔ رفیق کو اُن کے بات کرنے کا انتظار تھا۔ رفیق کو اُن کی خاموشی پر حیرت ہوئی۔ پھر مالک کی بیوی نے اپنے پیروں کو تھوڑی حرکت دی تو رفیق اُس طرف متوجہ ہوا۔

''نذیر نے اب ٹھیک نہیں ہونا۔'' مالک کی بیوی نے ایک لمبی سانس کھینچی۔ رفیق کو مالک کے نام کا پتا تھا لیکن اُس نے ہمیشہ اُسے اپنا مالک سمجھا تھا اور جب بھی اُس کا کوئی دوست نذیر کہہ کے مخاطب کرتا تو اُسے سخت ناگوار گزرتا اور اُس وقت بھی ایسے ہی لگا تھا۔ اُس نے ناگواری کے ساتھ مالک کی بیوی کو دیکھا۔ ''میری بہن اور بہنوئی اِس تکلیف میں میرے ساتھ شامل ہیں۔ ہمارا اور کوئی ہے بھی نہیں۔ یہ فیصلہ ہوا ہے کہ دکان اور مشینیں بیچ دی جائیں تا کہ ہم پیسہ کہیں لگا کے سکون کی زندگی گزارتی رہیں۔'' وہ رکی۔ رفیق اُس کے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔ مالک کی بیوی نے رفیق کی آنکھوں میں دیکھا۔ ''تم کل کہیں اور بندوبست کر لینا۔''

رفیق کو یک لخت غیر اہم کیے جانے پر برہمی بھی ہوئی لیکن وہ مالک کے وارثوں کے فیصلے کا پابند بھی تھا۔ وہ سر جھکا کے گلی والے دروازے کی طرف چل پڑا۔ اُسے اپنے پیچھے قدموں کی

چاپ سنائی دے رہی تھی لیکن اُس نے مُڑ کے نہیں دیکھا۔ اُس وقت اُس کی آنکھوں میں آنسو رکے ہوئے تھے اور سب دھندلا سا دکھائی دے رہا تھا۔ اُس نے دروازے میں مُڑ کے دیکھا تو عظمت اُس کے سامنے کھڑی تھی۔

''میری خوشی چند دِن کی تھی۔'' رفیق کا بدن ایک آہ سے کانپ گیا۔ ''کل میرا اندر بیٹھے خالہ کے بیٹے سے نکاح کر دیا جائے گا اور وہ گھر کا سربراہ ہوگا۔ ابا جی اِن لوگوں کو گھر میں گھسنے تک نہیں دیتے تھے۔ میری ماں شاید اُن سے بدلہ لے رہی ہے۔'' رفیق بُت بنے کھڑا تھا۔ عظمت نے ہاتھ بڑھایا جسے رفیق نے تھام لیا اور وہ کچھ دیر ایسے ہی کھڑے رہے۔ رفیق نے دوسرے ہاتھ سے عظمت کے آنسوؤں سے بھیگے چہرے کو چھوا تو عظمت نے ہتھیلی کے ساتھ اپنے گال کو رگڑا۔ ''پھیکے! میں شرمندہ ہوں۔'' وہ پھر خاموش ہوگئی اور رفیق نے دونوں ہاتھوں میں اُس کا آنسوؤں سے بھیگا چہرہ تھام لیا۔ ''ابا جی بیمار نا ہوتے تو اور بات تھی۔ اب میرے بس میں کچھ نہیں۔''

رفیق کو ایک دم جیب میں پڑے پیسے اور چابی یاد آ گئی۔ اُس نے پیسے اور چابی نکال کے عظمت کی طرف بڑھائے۔ رفیق کی آنکھوں سے بے بسی کے آنسو بہہ رہے تھے۔ عظمت نے اُس کی مٹھی کو بند کر دیا اور ایک آہ بھری۔ ''تم پیسے رکھو۔ تمھیں بھی ہر پیسے کی ضرورت ہے۔ چند دنوں کے اندر اندر دکان اور سارا سامان بک جانا ہے پھر میری ماں کچھ عرصہ آرام کی زندگی گزارے گی۔'' رفیق پوچھنا چاہتا تھا کہ چند دِنوں کے بعد کیا ہوگا؟ لیکن اُس نے خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا۔ شاید عظمت اُس کی خاموشی میں سے پھوٹتا سوال دیکھ گئی تھی۔ ''اُس کے بعد شاید داماد آسرا بن جائے۔'' وہ تلخ سا ہنسی۔ ''تم سب رکھو۔ چابی گھر میں بھی ہے۔ تم رات کہاں گزارو گے؟ پیسے بھی رکھو اور چابی بھی۔'' پھر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ رفیق نے اُس کا سر اپنی چھاتی کے ساتھ لگا لیا اور کچھ دیر کے بعد اُس کے گیلے گالوں پر اپنے ہونٹ رکھ دیے۔ عظمت نے اُس زرد روشنی میں رفیق کے چہرے کو اپنے ہاتھوں میں لے کے اُس کے ہونٹوں کو چھوا اور کچھ کہے بغیر دروازہ بند کر دیا۔

رفیق کچھ دیر سکتے کی کیفیت میں وہیں کھڑا رہا۔ وہ عظمت کو کھو چکا تھا اور شاید اُسے زندگی میں دوبارہ نا دیکھے۔ اُس نے سوچا کہ کوئی ایسا طریقہ ہو کہ اُسے ایک بار پھر دیکھ لے اور اُسے

دروازہ کھٹکھٹانے کے علاوہ کوئی اور حل نظر نا آیا۔ اور اگر مالک کی بیوی یا اُس کے بھانجے نے دروازہ کھولا؟ وہ پوچھے گا کہ چابی کا کیا کرے؟ اُس نے اپنی کم اعتمادی، خوف، جھجک اور بے چینی کو بس میں کر کے دروازہ کھٹکھٹایا اور قدموں کی چاپ سننے پر کان لگا دیے۔ صحن میں سے اُسے خاموشی ہی سنائی دی اور پھر اچانک آہستگی کے ساتھ دروازہ کھلا اور عظمت اُس کے سامنے کھڑی تھی۔ یہ اتنا غیر متوقع تھا کہ پہلے لمحے میں اُس کی سانس رُک گئی اور اگلے لمحے میں اُس نے عظمت کے نازک بدن کو اپنے مستری کے بازوؤں میں اتنی شدت سے جکڑا کہ اُسے پسلیوں کے کڑکڑانے کی آواز بھی سنائی دی۔ اُس نے پیار کی شدت کا دباؤ ویسے ہی رکھا اور نا ہی عظمت نے احتجاج کیا۔ رفیق نے اُس کے ہونٹوں پر ہونٹ رکھ دیے اور دونوں ایک شدت کے ساتھ جُڑے کھڑے رہے۔

رفیق تمام عمر اُسی طرح کھڑا رہتا کہ عظمت نے سرگوشی کی:

''کوئی آجائے گا تم اب جاؤ۔'' رفیق کے اندر غصے کی ایک لہر اُٹھ کے ختم ہو گئی۔ اُس کے اندر کسی نے عظمت کے کہنے پر عمل درآمد کرنے کو کہا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ چند ہی لمحے ہیں اور پھر ختم نا ہونے والی جدائی۔ اُس نے اپنی گرفت ڈھیلی کی تو اُسے عظمت کے بدن میں حرکت محسوس ہوئی۔ وہ تھوڑا ہٹ کے کھڑا ہو گیا۔ اُسے اپنی سانس پھولی ہوئی محسوس ہوئی۔ اُس نے عظمت کے گال چھوئے اور عظمت کو کھلے دروازے میں چھوڑ کے واپس چل پڑا۔ اُسے محسوس ہوا کہ عظمت کی نظریں اُس کی پشت پر ہیں لیکن اُس نے مڑ کے نہیں دیکھا، شاید وہ چاہتی تھی کہ ایک بار پلٹ کے دیکھ لے لیکن آہستہ اُٹھنے والا ہر قدم اُسے عظمت سے دور کرتا گیا۔

دکان کی طرف جاتے ہوئے وہ متضاد قسم کی کیفیتوں میں مبتلا تھا۔ اُس کے قدم تھکاوٹ کے وزن سے بوجھل تھے اور ایسے محسوس ہوتا کہ وہ دکان تک پہنچ نہیں پائے گا۔ جس وقت اُس کا بدن تھکاوٹ سے چور تھا تو اُس کا ذہن تر و تازگی کی ایک عمدہ مثال تھی۔ اُس نے سوچا کہ وہ جنگ ہارنے کے بجائے جیت کے جا رہا تھا اور اُس کے ہر قدم میں فتح کی گونج تھی۔ وہ جنگ کیسے جیتا تھا؟ عظمت کی شادی اُس کے خالہ زاد کے ساتھ طے ہو گئی تھی اور مالک اب زندگی بھر کے لیے ناکارہ ہو چکا تھا۔ اُس کی جیت عظمت کی محبت کے اظہار میں تھی جسے وہ اپنی زندگی کی صندوقچی میں بند کر کے اپنے ساتھ لیے پھرے گا۔

رات وہ اپنے مٹرگشت پر نہیں گیا اور نا ہی اُسے وہ خواب نظر آیا۔ اب خواب میں کیا

رکھا تھا؟ مالک زندہ ہونے کے باوجود مر چکا تھا اور وہ لوگ جن کا اُس کے ساتھ شاید محدود سا تعلق تھا اُسے اُٹھائے کسی طرف جا رہے تھے۔ عظمت کے ہونٹوں کا پہلا بوسہ اُس نے لیا تھا اور وہ اُن دونوں کا آخری ہو گا۔ اُس نے ہونٹوں کا بوسہ کیوں لیا؟ اُسے ایک دم یاد آیا کہ اُس نے کئی انگریزی فلموں میں، جو وہ اپنے ہوٹل کے دوستوں کے ساتھ دیکھا کرتا تھا، آدمی اور عورت کو ہونٹ چومتے ہوئے دیکھا تھا۔ نا سمجھتے ہوئے بھی اُس نے وہی کیا جو اُس نے کئی بار دیکھا تھا۔

وہ رات پُر سکون تھی اور وہ اُس رات وقفوں سے جاگ بھی جاتا تھا جیسے کسی یاد نے اُس کی نیند کے دروازے پر دستک دی ہو۔ اِسی نیم بیداری اور بیداری میں رات گزارنے کے بعد وہ صبح تازہ دم جاگا۔ اُس نے اپنا مختصر سا سامان اپنے تکیے کے نیچے رکھ کے بستر کو لپیٹا، دکان کو تالا لگایا اور سامنے ہوٹل میں چلا گیا جہاں اُس نے بستر چوبیس گھنٹوں کے لیے منیجر کے حوالے کر کے غسل کیا اور اپنا جسم دیکھا۔ اُسے چھاتی بھری ہوئی نظر آئی اور وہاں سیاہ بال بھی نظر آ رہے تھے۔ وہ مطمئن سا نہاتا گیا۔ ابھی ناشتہ کرنے والوں کی بھیڑ نہیں تھی اور اُس نے منیجر اور اپنے چند دوستوں کو اپنے حالات سے باخبر کرنے کے بعد اُن سے مشورہ اور مدد چاہی۔ یہ ایک مختصر لیکن شدت سے بھرپور مشاورت تھی۔ اُسے اڈے پر ایک ڈرائیور سے ملنے کو کہا گیا جو منیجر کا دوست اور چند لوگوں کا جاننے والا تھا۔

رفیق نے اپنا بستر وہیں چھوڑا اور اڈے کی طرف اُس ڈرائیور کی تلاش میں چل پڑا!

....فیاض جب بھائی فقیر حسین کی دکان پر گیا تو وہ ایک اجنبی کے ساتھ باتوں میں مصروف تھا۔ وہ دکان کے دروازے میں کھڑا اُنھیں دیکھتا رہا۔ وہ کسی گہری بحث میں اُلجھے ہوئے تھے؛ کبھی اُن کی آواز بلند ہو جاتی اور کبھی وہ مسکرانے لگتے۔ اُسے اجنبی کبھی دیکھا دیکھا اور کبھی بالکل غیر لگتا۔ اُس نے سوچا کہ وہ کب تک یوں ہی کھڑا اُنھیں دیکھتا رہے۔ وہ شاید سارا دِن ایسے ہی باتیں کرتے رہیں۔ وہ آہستہ سے اندر داخل ہوا تو اُن دونوں نے اُسے دیکھا۔ بھائی فقیر حسین مسکرا اُٹھا۔ ''ہمیں تمھارا ہی انتظار تھا۔'' فیاض ایک دم پریشانی کا شکار ہو گیا۔ وہ بغیر کسی ردِعمل کے اُنھیں دیکھتا رہا۔ ''جانتے ہو؟'' اُس نے سامنے بیٹھے ہوئے آدمی کی طرف اشارہ کیا۔ فیاض نے نفی میں سر ہلایا۔ وہ آدمی مسکرا اُٹھا۔

''یہ کیسے جانے گا؟'' اُس نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''میں ایک عمر سے یہاں نہیں ہوں۔ جب بھی آیا تو بغیر کسی وجہ کے چوروں کی طرح آیا۔ مجھے تو ایسے آنے میں ایک مزہ آنے لگنا شروع ہو گیا ہے۔''

فیاض کو یہ باتیں کچھ عجیب لگیں۔ وہ آنکھیں پھاڑے اُس آدمی کو دیکھتا رہا۔

''یہ اُستاد ر. فتو) ہے۔ تم اب اِس کے ساتھ کام کرو گے۔'' فیاض نے اُس آدمی کو غور کے ساتھ دیکھا۔ وہ بھائی فقیر حسین سے عمر میں کم اور دبلا لگا۔ اب وہ دونوں فیاض کو غور سے دیکھ رہے تھے جس وجہ سے فیاض کچھ گھبرا گیا۔ اُس آدمی کے چہرے پر مسکراہٹ تھی اور بھائی فقیر حسین کچھ پریشان لگا۔ فیاض کو اُس آدمی کی مسکراہٹ اور بھائی فقیر حسین کی پریشانی کی وجہ سمجھ میں نا آئی۔ فیاض کو اپنا چہرہ جلتے ہوئے محسوس ہوا۔ اُسے اپنے آپ پر غصہ بھی آیا کہ وہ اتنا گھبرا کیوں گیا ہے؟

''کچھ کھا کے آئے ہو؟'' بھائی فقیر حسین نے پوچھا۔ فیاض نے نفی میں سر ہلایا۔ ماں نے ابھی چولہا گرم نہیں کیا تھا اور بھائی فقیر حسین نے جلدی آنے کا کہا تھا اِس لیے فیاض یہی مطلب

سمجھا تھا کہ کھانے کو بھی ملے گا۔ اُسے ایک دم بھوک کا بھی احساس ہوا۔ وہ کچھ دیر کے لیے وہاں سے غیر حاضر ہو جانا بھی چاہتا تھا۔ "میرے ہاں چلے جاؤ۔ میں نے تمھارے لیے کچھ پکانے کا کہا ہوا ہے۔" فیاض کے اندر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ کھانے کو بھی اچھا مل جانا تھا اور بھائی فقیر حسین کی بیوی کے ساتھ اُسے ملنے میں ایک ایسی خوشی کا احساس ہوتا کہ اُس کے ذہن اور جسم میں کافی دیر تک ایک گونج پیدا ہوتی رہتی۔ وہ اکثر سوچتا کہ گونج آتی کہاں سے تھی؟

بھائی فقیر حسین کی بیوی فیاض کو اپنے انتظار میں لگی۔ فیاض جھجکنا نا چاہنے کے باوجود جھجک رہا تھا اور بھائی فقیر حسین کی بیوی مسکرائے جا رہی تھی۔ اُس نے فیاض کو ایک چارپائی پر بٹھایا جہاں گلاس اور ایک تھالی پڑے ہوئے تھے۔ وہ اندر چلی گئی اور پھر ایک تھال لا کے اُس کے سامنے رکھ دیا۔ تھال میں ایک پراٹھا اور آلو اور انڈے کی بھجیا تھی جسے دیکھتے ہی اُس کے خالی پیٹ کے اندر ایک اژدہائی حرکت ہوئی اور دیسی گھی سے نچڑتا ہوا لقمہ منہ میں ڈالا۔ وہ جب بھی بھائی فقیر حسین کے ہاں کھانا کھاتا اُسے اپنی غربت منہ چڑاتے ہوئے محسوس ہوتی۔ بھائی فقیر حسین کی بیوی بھی اُسی چارپائی پر بیٹھ گئی۔ وہ ایک لقمہ توڑ کے فیاض کے منہ میں ڈالنے لگی اور دوسرا خود کھاتی۔ فیاض نے بھی مدافعت نا کی اور بھائی فقیر حسین کی بیوی مسکراتے ہوئے پہلا پراٹھا ختم کر گئی اور پھر دوسرے سے لقمے توڑنے لگی۔ "درمیان میں لسی پئیں گے۔ جب درمیان آئے تو بتا دینا۔" اُس نے ہنستے ہوئے کہا اور فیاض بھی ہنسنے لگا۔ اِسی طرح ہنستے ہوئے وہ کھاتے رہے اور لسی کے گھونٹ بھی لیتے گئے۔ فیاض اپنی بھوک بھول چکا تھا اور وہ ہر لقمے کو نئے طریقے سے کھاتا جاتا تھا۔ وہ پیٹ بھر جانے کے باوجود شام تک کھائے چلے جانا چاہتا تھا۔ بھائی فقیر حسین کی بیوی نے ایک لمبا سانس لیا جیسے بچھڑنے کا وقت آ گیا ہو۔ پھر اُس نے فیاض کے گال تھپتھپائے اور اُس کے بالوں میں انگلیاں پھیریں۔ فیاض نے بھی اُس کے گالوں کو چھوا اور اپنی انگلیوں کا زنبور بنا کے اُس کی ناک کو کھینچا تو وہ قہقہہ لگا کے ہنس پڑی۔ فیاض کی ماں بتایا کرتی تھی کہ جب وہ چھوٹا تھا تو اُس کی ناک کو انگلیوں کے زنبور سے کھینچا کرتا تھا۔ اب وہ دونوں آمنے سامنے کھڑے تھے۔ فیاض کو بھائی فقیر حسین کی بیوی کے بدن سے ایک خوش گوار مہک اُٹھتے ہوئے محسوس ہو رہی تھی اور اُس نے اِس خوشبو کو اپنے احساس میں زندہ رکھنے کے لیے ایک لمبی سانس لی۔ اُس خوشبو میں صابن، تیل اور بدن کی اپنی مہک بھی شامل تھی۔

''ملتے رہنا۔'' بھائی فقیر حسین کی بیوی نے پھر ایک لمبا سانس لیا۔ فیاض کو اُس کی بات عجب سی لگی اور اُسے ایک ہلکا سا چکر بھی آیا۔ وہ کہیں جا رہا تھا؟ اُسے اچانک یاد آیا کہ بھائی فقیر حسین کی دکان پر ایک دیکھا اور نا دیکھا ہوا آدمی بیٹھا تھا اور شاید اُسے اُس آدمی کے ساتھ کہیں بھیجا جا رہا تھا۔ کہاں بھیجا جا رہا تھا؟ کیا وہ بھائی فقیر حسین کی بیوی سے پوچھ لے؟ وہ سوال کر کے اپنایت میں ڈوبی ہوئی اُداسی کو ختم نہیں کرنا چاہتا تھا۔ بھائی فقیر حسین کی بیوی نے اُسے گلے سے لگا لیا۔ یہ فیاض کے لیے بالکل غیر متوقع تھا۔ وہ اُس کے ساتھ لگا کھڑا رہا اور بھائی فقیر حسین کی بیوی کے بدن سے نکلتی ہوئی خوشبو میں اُکھڑے اُکھڑے سانس لیتا تھا۔ بھائی فقیر حسین کی بیوی نے اُسے ایک دم اپنے سے جُدا کیا جیسے اچانک کچھ یاد آ گیا ہو! پھر اُس نے فیاض کا ماتھا چوما اور فیاض کو سمجھ نہیں آئی کہ ایسا کیوں ہوا لیکن اُس کی آنکھوں سے آنسو موسلا دھار بارش کی طرح بہہ نکلے۔ وہ روتا جاتا تھا اور بھائی فقیر حسین کی بیوی اُسے پیار کیے جاتی تھی۔ پھر وہ خاموش ہو گیا جیسے کبھی کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے تھے۔ فیاض کو خیال آیا کہ اُس کی سرخ آنکھیں اُسے باہر شرمندہ نا کروادیں، اُس نے منہ ہاتھ دھونے کا فیصلہ کیا۔

فیاض جب دکان میں گیا تو بھائی فقیر حسین گاہکوں کے ساتھ مصروف تھا اور رفیق اُسے دل چسپی سے دیکھ رہا تھا۔ فیاض ایک طرف بیٹھ کے سوچنے لگا کہ اُس نے اُسے کہاں دیکھا ہے۔ پھر اُسے اچانک یاد آیا کہ وہ ترکھان ہے اور اُس کی ماں نظر خراب ہونے تک ڈیرے والوں کی عورتوں کی جوئیں نکالا کرتی تھی اور اُن کے کئی ذاتی کام کرنا بھی اُس کے ذمے تھا۔ اُسے یہ بھی یاد آیا کہ اُس آدمی کے متعلق مشہور تھا کہ وہ ڈیرے والوں کی وجہ سے گاؤں چھوڑ گیا تھا۔

بھائی فقیر حسین فارغ ہو کے اُن کے پاس آ گیا۔ اُس کے چہرے پر سنجیدگی تھی اور فیاض کو لگا کہ دکان میں ایک دم کھچاؤ آ گیا ہے۔ اُسے کھچاؤ کی وجہ کی تو سمجھ نہیں تھی، اُس نے بھی خود کو اُس کھچاؤ کا حصہ محسوس کیا۔ وہ کچھ خوف زدہ بھی تھا۔ کیا وہ جان گیا تھا کہ اُس نے اُس کی بیوی کو چھوا تھا، وہ جو اُسے ڈیرے والوں کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار کر رہا تھا اور وہ خود بھی اُن کا مقابلہ کرنا چاہتا تھا۔ اُس کے ذمے کچھ قرض بھی تھے جو اُس نے چکانے تھے۔ لیکن اُس وقت وہ بھائی فقیر حسین سے خوف زدہ تھا۔

''فیاض!'' بھائی فقیر حسین کی آواز میں اُس کے چہرے والی سنجیدگی تھی۔ فیاض نے

جواب دینے کے بجائے اُسے دیکھنا مناسب سمجھا۔ ''رفیق کو جانتے ہو؟'' اب بھائی فقیر حسین تھوڑا سا مسکرایا۔ فیاض کو اُس مسکراہٹ میں اپنائیت بھی محسوس ہوئی۔

''کچھ کچھ۔'' فیاض نے جھجکتے ہوئے کہا۔ اُس نے سوچا کہ اگر مزید کچھ معلوم کیا گیا تو وہ کیسے بتائے گا کہ اُس کی ماں ڈیرے والوں کی عورتوں کے ذاتی قسم کے کام کیا کرتی تھی۔ اُس نے آگے کوئی بات کرنے سے پہلے خاموشی کی دانش مندی میں پناہ ڈھونڈی۔

''اِس کا نام رفیق ہے۔'' فیاض کو نام بھی یاد آ گیا۔ بھائی فقیر حسین اُس کا نام پہلے بھی بتا چکا تھا اور شاید اُسے یاد نہیں رہا تھا۔ اُس نے پہلی بار رفیق کو غور سے دیکھا۔ رفیق دونوں کو دیکھتے ہوئے دل چسپی سے مسکرا رہا تھا۔

''یہ ابھی چھوٹا ہے۔ مجھے کہاں جانتا ہوگا؟'' رفیق ابھی تک مسکرا رہا تھا۔

''اتنا بھی چھوٹا نہیں۔'' بھائی فقیر حسین ہلکا سا ہنسا۔ فیاض کو اُس کی ہنسی میں ایک وار محسوس ہوا۔ کیا بھائی فقیر حسین جانتا تھا کہ اُس کی بیوی اپنے ہی کسی ڈھنگ سے اُسے پسند کرتی تھی؟ فیاض نے وہ وار خاموشی سے سہہ جانے کا فیصلہ کرلیا۔ ''اِس میں وہ سب گن ہیں جو ہماری عمر کے کسی آدمی میں موجود ہونے چاہئیں۔ مسئلہ صرف اُنھیں دیکھنے اور پہچان جانے کا ہے۔ یہ میرے ساتھ کام کرتا رہا ہے۔'' اب تک وہ رفیق سے مخاطب تھا۔ فیاض کو بھائی فقیر حسین کی اِس بات سے اپنا کچھ دیر پہلے کا شک بے بنیاد لگا۔ اب اُس نے اپنا رُخ فیاض کی طرف کیا، ''رفیق اور میں بچپن کے دوست ہیں۔ پھر یہ ڈیرے والوں کے خوف سے شہر بھاگ گیا۔ ہم نے الیکشن میں اُنھیں ہرایا۔ ہمارا آدمی بے شک اب اُن کے ساتھ مل جائے مجھے اُس کی اتنی پروا نہیں ہے لیکن سچ بات تو یہ ہے کہ ہم نے اُنھیں ہرایا ہے اور ہمارے جیتنے کی وجہ عام آدمی کو اُس کو مقام دکھانا ہے اور یہ ہم نے کرتے جانا ہے۔ رفیق نے کئی سالوں کی محنت کے بعد ایک ویگن بنائی ہے جو یہاں سے شہر تک چلا کرے گی۔ اِس ویگن کے چلنے سے ٹانگے والوں کا کچھ عرصے کے لیے نقصان ضرور ہوگا لیکن ہم اُنھیں کسی اور طرف لگنے میں مدد دیں گے جو ہم کر رہے ہیں۔ اِس سے ڈیرے والوں کے مالی نقصان کا آغاز بھی ہونا ہے۔ ہم نے ٹانگے ختم کروانے ہیں جس سے اُن کو فی پھیرا ملنے والے دس روپے نہیں ملیں گے۔ چند سالوں کے بعد تم نے بھی اپنی زمین کی اُن سے مانگ کر دینی ہے۔'' دو عورتیں اُسی وقت دکان میں داخل ہوئیں اور بھائی فقیر حسین اُن کے ساتھ مصروف

ہو گیا۔ رفیق اپنی جگہ سے اُٹھ کے فیاض کے پاس آ گیا۔

''تم مجھے نہیں جانتے۔ میں خدا بخش ترکھان کا بیٹا ہوں۔ میرا باپ ڈیرے والوں کے کام کیا کرتا تھا۔'' فیاض کو خدا بخش یاد آ گیا۔ وہ اکثر بن بلائے ہی ڈیرے پر آتا رہتا تھا اور برآمدے میں پڑی چارپائیوں کی ضرورت کے مطابق مرمت کر دیا کرتا تھا اور اسی طرح اُسے گھر میں بھی دیکھا تھا لیکن اُس نے اُن کی کبھی کوئی چارپائی نہیں ٹھوکی تھی۔ فیاض کو اُس کا چمڑے کا جھولا یاد آ گیا جس میں سے وہ اپنے اوزار نکالا کرتا تھا۔

''سمجھ گیا۔'' فیاض نے جواب دیا۔ پھر اُسے یہ بھی یاد آ گیا کہ وہ اُسے بابا ترکھان کہا کرتا تھا۔ ''بابے ترکھان نے ہماری کبھی کوئی چارپائی یا پیڑھی نہیں ٹھوکی تھی۔'' فیاض کو رفیق کے چہرے پر نیا رنگ آ کر نیا تاثر لاتے محسوس ہوا۔ اُسے اپنی بات پر حیرانی بھی ہوئی۔

''میرے ماں باپ غریب تھے اور وہ وہیں جاتے تھے جہاں سے اُنھیں کچھ ملتا۔'' رفیق کی آواز میں شرمندگی تھی۔ ''اب میں اُس طرح کے کئی قرض اُتارنے آیا ہوں۔'' اُسی وقت بھائی فقیر حسین بھی اُن کے پاس آ کے بیٹھ گیا۔

''میرا کام ایسا ہے کہ لگاتار بیٹھے رہنا ممکن نہیں۔'' بھائی فقیر حسین نے سگریٹ سلگا لیا۔ فیاض کی نظر اچانک ایک طرف کو پڑی کتاب کی طرف گئی تو بھائی فقیر حسین نے قہقہہ لگایا۔ ''آج اُس کا وقت نہیں۔'' فیاض کا چہرہ ایک دم سرخ ہو گیا۔ ''رفیق کی یہ ویگن صبح اپنا پہلا پھیرا لگائے گی۔'' بھائی فقیر حسین کے چہرے سے مسکراہٹ جاتی رہی تھی اور اب وہ سنجیدگی کے ساتھ اُن دونوں کو دیکھ رہا تھا۔ ''میں نے آج رات گاؤں میں دونوں مسجدوں سے اعلان کروا دینا ہے کہ کل سے شہر کے لیے ویگن چل رہی ہے اور راستے میں تین گاؤں پڑتے ہیں وہاں کی مسجدوں میں بھی پیغام بھجوا دوں گا کہ شہر جانے والے گھروں سے نکل آئیں۔ شروع میں کافی مخالفت ہونی ہے لیکن لوگوں کو ملنے والی سہولت نے ہی اِس مخالفت کو ختم کر دینا ہے۔'' اُسی وقت گاہک آ گئے اور بھائی فقیر حسین اُن کے پاس چلا گیا۔

''آپ کو ویگن بنانے کا خیال کیسے آیا؟'' فیاض نے سُن رکھا تھا کہ بابے خدا بخش کا بیٹا شہر میں ایک بڑا مستری ہے اور اُس کے بنائے ہوئے پرزوں کے بغیر شہر کی کوئی گاڑی نہیں چل سکتی۔ اب اُسے رفیق اور اُس کے والدین کے متعلق گاؤں میں کہی جانے والی سب باتیں یاد آ گئی

تھیں۔ اُسے تجسس تھا کہ رفیق ویگن کیوں چلانا چاہتا تھا۔

''میں جب تانگے میں شہر گیا تھا تو وہ سفر بہت تکلیف دہ تھا۔ کئی دِن میری کمر اور پسلیوں میں درد رہا۔ میں نے اُس وقت فیصلہ تو نہیں کیا لیکن میں پھر تانگے میں کبھی نہیں گیا۔'' رفیق نے مسکراتے ہوئے پسلیوں کو دبایا جیسے ابھی تک وہاں درد ہو۔

''آپ پھر کیسے آتے اور جاتے تھے؟'' بھائی فقیر حسین ابھی تک گاہکوں کے ساتھ مصروف تھا۔ رفیق، فیاض کے سوال سے تھوڑا سا مسکرایا۔

''پیدل اور کیسے؟'' وہ مسکرائے جا رہا تھا۔

''آپ تھکتے نہیں تھے؟'' رفیق کو فیاض کے سوال سے اپنا پہلا سفر یاد آ گیا اور پھر عظمت کو ملنے جانا۔ اُس نے دل ہی دل میں ''عظمت'' کہا اور ایک آہ بھری۔

''تھکاوٹ پسلیوں کے درد سے بہتر تھی۔'' وہ دونوں ہی ہنس پڑے۔ اِس بار رفیق کے ہنسنے میں بے ساختگی نہیں تھی۔

''تم لوگ آپس میں کیا قہقہے لگا رہے ہو؟'' بھائی فقیر حسین نے واپس آ کر پوچھا۔

''ایسے ہی!'' فیاض نے جلدی سے جواب دیا۔

''ہم ویگن کی بات کر رہے تھے۔'' بھائی فقیر حسین ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔ ''اِس ویگن کے چلنے سے جہاں کئی لوگوں کی روزی پر اثر پڑنا ہے وہاں کئی سہولتیں بھی ہوں گی۔'' اُس نے اب رفیق کی طرف دیکھا۔ ''مسافر تھوڑے وقت میں شہر پہنچ جایا کریں گے اور اُنھیں واپس دیر سے پہنچنے کا بھی ڈر نہیں ہو گا۔'' اُس نے چند سیکنڈ سوچا، ''تم نے روز کتنے چکر لگانے ہیں؟''

''دو۔''

''مطلب یہ ہوا کہ کل سے ٹانگے والے فارغ! فائدہ یہ ہوا کہ لوگ دوسرے پھیرے میں جا کے بھی سورج غروب ہونے تک واپس گھر پہنچ جائیں گے۔ اور ٹانگے والے احتجاج ضرور کریں گے لیکن ہر کوئی زندہ رہنے کے لیے اپنے ذرائع بنا لیتا ہے۔ اُنھوں نے متبادل راستے اختیار کر لینے ہیں۔ جیسے میں نے پہلے بھی کہا تھا کہ اِس کا اصل نقصان ڈیرے والوں کا ہونا ہے۔ اُنھیں اڈے سے پیسے ملنے بند ہو جانے ہیں۔ اُنھوں نے اِسے ایک مختلف رنگ دینا ہے۔ اب اُنھیں تانگے والوں کے ساتھ ہمدردی ہو جانی ہے۔'' اُسی وقت دکان میں ایک گاہک آ گیا اور بھائی فقیر

نے گلا صاف کیا۔ ''وہ ہوٹل دیکھ رہے ہو؟'' رفیق نے اچانک سوال کیا۔ فیاض نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''اُس کے بالکل سامنے ایک چھوٹی سی فیکٹری تھی جسے میں ہمیشہ دکان کہتا کیوں کہ وہ ایک دکان میں تھی اور میں وہاں کام کیا کرتا تھا۔'' فیاض جانتا تھا کہ رفیق شہر میں کہیں کام کیا کرتا تھا لیکن اُس نے کام کرنے کی جگہ اور کام کے متعلق پوچھنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ وہ خالی نظروں کے ساتھ رفیق کو دیکھتا رہا۔ ''اُس کا مالک ایک لاپروا قسم کا آدمی تھا جو سارا دِن اخبار پڑھتا، چائے پیتا اور ویسی باتیں کرتا جو فقیر حسین کرتا ہے۔'' فیاض اپنایت سے مسکرایا کہ بھائی فقیر حسین کی طرح کوئی اور بھی اُس جیسی باتیں کرتا تھا۔ ''اُس نے مجھے نوکری دی اور میں نے محنت کر کے اُس کے کام کو چلا دیا۔ ہم دونوں مالک اور ملازم تھے، وہ میرا بزرگ اور میں اُس کا عزیز تھا، ہم دوست تھے اور اجنبی بھی کیوں کہ اُس کی باتیں تب میری سمجھ میں نہیں آتی تھیں۔ میں نے اُس جیسا شخص پہلے نہیں دیکھا تھا۔ تب میری عمر ہی کیا تھی؟ اُس نے مجھے بزرگی کے رشتے سے کچھ نہیں سکھایا لیکن اپنی لاتعلقی سے ایک کاریگر بنا دیا۔ پھر وہ مجھے اپنے گھر لے جانے لگا۔ میں گھر جاتے ہوئے گھبراتا تھا لیکن پھر میں وہاں شوق سے جانے لگا۔ وہاں میں نے عظمت کو دیکھا۔'' رفیق خاموش ہو گیا۔ فیاض نے اُس کی طرف دیکھا۔ فیاض کی نظر میں تجسس کی بے یقینی اور بے چینی تھی۔ رفیق خاموش بیٹھا سامنے دیکھتا تھا اور فیاض اب اُلجھن میں گھرا ہوا اُس کے بولنے کا انتظار کرتا تھا۔ رفیق نے ایک آہ بھری اور ہلکے سے مسکرایا جیسے اُسے سب کچھ یاد آ گیا ہو۔ ''میں اُس آدمی کو اُستاد جی، باؤ جی، صاحب جی یا سیٹھ جی کے بجائے مالک ہی کہتا اور اُس نے بھی مجھے کبھی منع نہیں کیا۔ عظمت مالک کی بیٹی تھی۔ میں نوکری ڈھونڈتے جب مالک سے ملا تو جس طرح وہ بیٹھا ہوا تھا عظمت اُسی طرح اکواسی سی، پریشان سی اور لاتعلق سی بیٹھی سامنے دیکھ رہی تھی، صرف اُس کے پاس چائے کی پیالی اور گود میں اخبار نہیں تھا۔ میں جب بھی گیا وہ اُسی طرح بیٹھی ہوتی۔ پھر ایک دِن وہ میرے لیے چائے لائی۔ مالک بیوی کے ساتھ کہیں چلا گیا تھا۔ وہ چائے تھما کے باتیں کرنے لگی۔ وہ بولتی تھی اور میں سنتا تھا۔'' رفیق تلخ سا ہنسا جیسے زخم کے درد کو چھپانے کے لیے سسکاری بھر رہا ہو۔ ''اور میں سنتا تھا اور وہ بولتی تھی۔ پھر وہ ہنسی۔ کہنے لگی کہ چائے تو پیؤ۔ اور میں نے چائے کا پہلا گھونٹ لیا۔ ہم دو بار اور ملے۔'' رفیق خاموش ہو گیا۔ رفیق کی خاموشی فیاض پر بھاری گزرنے لگی۔ رفیق کی آواز میں بسے درد نے اُس کا سانس دبانا شروع کر دیا۔

''پھر؟'' اُس نے بے چینی سے پوچھا۔

''پھر؟'' رفیق ہنسا۔ اِس بار اُس کی ہنسی میں خالی پن کی گونج تھی۔ ''پھر یہ ہوا کہ اُسے اُس کی ماں نے پنجرے میں بند کر دیا اور میں یہاں تمھارے پاس ہوں۔'' رفیق خاموش ہو گیا۔ وہ سامنے دیکھتا تھا اور بالوں میں اُنگلی سے کنگھی کرتا تھا۔ ''وہ ملاقاتیں لمبی نہیں تھیں۔'' رفیق نے آہ بھری۔ ''بس اتنی کہ ہاتھ چھوا، گال چھوئے اور ایک ہلکا سا دھکا کہ جانے کا وقت تھا۔'' پھر ایک آہ۔ ''میں ویگنوں میں چھوٹا بنا، بسوں میں کنڈکٹری کی، ڈرائیوری کی، سروس سٹیشنوں پر کاریں دھوئیں، بہت کام کیے کہ عظمت کو کسی کام میں بھول جاؤں لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔ کیا ہو سکتا ہے؟'' وہ اب کھل کے ہنسا۔ اُس کی ہنسی میں پہلے والا درد، تکلیف، محرومی یا مایوسی نہیں تھے۔ اُس ہنسی میں ایک کھلنڈرا پن تھا جو فیاض کو اصلی لگا۔ اُس نے سوچا کہ رفیق کو ایک دم کیا ہو گیا ہے؟ ''اب کیا ہو سکتا ہے؟ یہ درد ہے ہی بہت ماں یاوا، نا مُتا ہے اور نا مارتا ہے، بس زندہ رکھے ہوئے ہے کہ اڈے کے آس پاس کہیں نظر آ جائے شاید۔'' وہ خاموش ہو گیا۔ ''جاؤ اور چائے لاؤ۔ اُستاد کے دکھ کے چسکے نا لو۔''

فیاض اب خالی وقت میں رفیق کے متعلق سوچتا رہتا۔ کیا بھائی فقیر حسین کی بیوی کہیں عظمت تو نہیں؟ اگر وہ عظمت تھی تو رفیق کی اُس کے ساتھ ملاقات ہوتی ہو گی؟ اگر ملاقات ہوتی تھی تو اُس نے یہ کیوں نہیں بتایا کہ عظمت اُن کے گاؤں میں ہی ہے اور اگر وہ گاؤں میں ہوتی تو وہ کہاں ملتے؟ پھر اُسے خیال آیا کہ بھائی فقیر حسین کی بیوی عظمت نہیں تھی۔ پھر ایک نئے خیال کا کوندا اُسے لرزا گیا۔ کیا بھائی فقیر حسین کی بیوی کسی رفیق کی عظمت ہی نا ہو؟ ایسے رفیق کی جس کے ساتھ اُس کا ایسی عمر میں ملنا ہو جو اُس کی اب ہے اور وہ اُسی وقت میں زندہ ہو اور اُسے ملتے ہی اُسے وہ رفیق یاد آ جاتا ہو اور وہ اُس کے گال ایسے چھوتی ہو جیسے رفیق کے چھوتی تھی؟ کیا وہ رفیق اُس سے بچھڑتے وقت ایسے ہی رویا تھا جیسے وہ رویا تھا؟ موسم ٹھنڈا تھا، ٹھنڈی ہوا بھی مند مند چلتی تھی اور اُسے اِس ٹھنڈ میں پسینہ آ گیا۔ یہ سب کیا تھا؟ وہ رفیق کے لیے کیا کر سکتا تھا؟ کیا عظمت کے گھر کا راستہ سمجھ کر اُسے رفیق کا پیغام پہنچا دے؟ اُسے خیال آیا کہ کیا کسی ترکھان کا پیغام لے کے جانا اُس کے لیے مناسب ہو گا؟ اگر ترکھان کا پیغام لے کے جانا مناسب نہیں تو پھر وہ اُسی ترکھان کا ملازم کیوں تھا؟ اُس نے سوچا کہ اُس نے تو اِس بات پر کبھی غور ہی نہیں کیا تھا۔

''ایک بات کہوں؟'' فیاض نے ایک یخ بستہ سہ پہر کو رفیق سے پوچھا۔ چند دِن پہلے رفیق نے کافی خرچ کر کے ویگن کا ہیٹر ٹھیک کروایا تھا۔ ویگن سٹارٹ تھی اور وہ اُس سہ پہر کی یخ بستگی میں نکھے بیٹھے ہوئے تھے۔ رفیق نے خالی نظر سے فیاض کی طرف دیکھا اور اثبات میں سر ہلایا۔ ''میں عظمت کے گھر تمھارا پیغام لے جانے کو تیار ہوں۔'' پہلی ملاقات کے بعد فیاض، رفیق کو 'آپ' کے بجائے 'تم' کہنے لگا تھا۔

''نہیں! اگر اُس نے انکار کر دیا تو میری زندگی کا سب سے خوب صورت خواب ٹوٹ جائے گا۔ میں بالکل خالی ہو جاؤں گا۔ میں خالی نہیں ہونا چاہتا۔ مجھے مل کے شاید وہ مایوس ہو جائے۔ میں اُس ہلکے سے دھکے کے جھٹکے کے بھاری پن کو لیے پھر رہا ہوں۔ نہیں!'' فیاض کو یہ عجیب سا لگا۔ ممکن ہے کہ عظمت زندہ ہی نا ہو یا وہ شہر ہی چھوڑ گئی ہو یا ممکن ہے وہ پنجرے کی دیوار توڑ کے اُس کے انتظار میں ہو؟

''یہ بھی ممکن ہے کہ وہ تمھارے انتظار میں ہو؟''

''میں نے سنا ہے کہ وہ انتظار نہیں کرتیں۔'' رفیق کے لہجے میں ایک دوری تھی۔ فیاض نے مزید کچھ کہنا مناسب نہیں سمجھا۔ کیا کوئی اور رفیق اُن کے گاؤں کی عظمت کو ملنا چاہتے ہوئے بھی ملنے سے گریزاں ہوگا؟ اور شاید لاری اڈے کے کہیں آس پاس والی عظمت بھی کسی لڑکے کو گلے لگا کے ماضی میں جا کے اُسے چومتی ہوگی؟

فیاض نے بھی ایک آہ بھری!

رفیق کبھی دوسری ویگن خریدنے کی بات کرتا اور کبھی اِس ویگن کو بیچ کے بس خریدنے کا بھی سوچتا۔ اُس نے شہر میں کسی سے رابطہ کیا تھا، وہ لوگ قسطوں پر بسیں بیچتے تھے۔ بھائی فقیر حسین اور رفیق دونوں دیر تک مختلف پہلوؤں پر بحث کرتے رہتے۔ فیاض کو کبھی خیال آتا کہ اُسے بھی کسی وقت میں بھائی فقیر حسین کے سوچے ہوئے منصوبے کا حصہ بننا ہی ہوگا۔ اب اُس نے روزانہ دو کرایے پار کرنے شروع کر دیے۔ ویگن پہلے سے زیادہ کما رہی تھی، کسی دِن تین تین چکر بھی لگ جاتے۔ جس دِن تین چکر لگتے رفیق اُسے ڈیڑھ سو روپے دیتا اور اُس دِن وہ تین کرایے پار کرتا۔ فیاض کی ماں نے ایک عرصے کے بعد نئے کپڑے سلوائے تھے اور اُس دِن وہ فیاض سے شرما رہی تھی اور رو بھی رہی تھی۔ وہ نئے کپڑے اُس کی ماں کے لیے ایک جیت تھی کہ اُس کا بیٹا کچھ

نا ہونے کے باوجود گھر میں کمائی لا رہا تھا۔ وہ اب ڈیرے والوں کی عورتوں سے برابری پر ملتی جس کا وہ برا نا مناتیں اور یہی کہتیں کہ ہر ماں کا بیٹا فیاض جیسا ہونا چاہیے۔

فیاض ویگن کے معمول سے اُکتا گیا۔ اُس نے محسوس کیا کہ ویگن سے اُسے جو مل رہا ہے اُس سے زیادہ نہیں مل سکتا۔ تین سے زیادہ کرایے اگر پار کرے گا تو رفیق کو شک ہو جانا ہے اور جو مل رہا تھا وہ اُس سے زیادہ لینا چاہتا تھا۔ پھر وہ ویگن کے ایک ہی سفر سے بھی تنگ آ گیا تھا۔ وہ محسوس کرتا کہ اُسے اب کچھ اور کرنا چاہیے قطع نظر اِس کے کہ وہ کما کیا رہا تھا؟ اگر کمائی زیادہ ہو سکے تو سونے پر سہاگہ ہوگا۔ وہ اِس مسئلے پر سوچتا رہتا۔ وہ جتنا سوچتا اُتنا ہی اُلجھتا جاتا اور جس دِن نا سوچتا اُس دِن اُسے یہی اُلجھن ہوتی کہ کیا وہ اِسی سو روپے اور دو کرایوں کی چوری پر زندگی گزار دے گا؟ رفیق اور بھائی فقیر حسین اُس کے ساتھی تھے اور وہ دونوں ہر روز اُس سے آگے نکلتے جا رہے تھے۔ اُسے ایک بار دیکھی ہوئی کتوں کی دوڑ یاد آ جاتی۔ وہ ڈیرے والوں کے ساتھ تازی کتوں کی دوڑوں کے مقابلے دیکھنے گیا تھا۔ دو کتے جب خرگوش کے پیچھے بھاگ رہے ہوتے تو آگے نکل جانے والے کتے کی کوشش ہوتی کہ وہ دونوں کے درمیان میں فرق کو بڑھاتا جائے۔ بھائی فقیر حسین اور رفیق اُس کے ساتھ یہی کر رہے تھے اور اُسے کسی طرح اِس فرق کو کم کرنا تھا۔ ویگن کی آمدنی اِس فرق کو بڑھا رہی تھی جب کہ وہ یہ دوڑ جیتنا چاہتا تھا۔

ایک دِن فیاض نے رفیق کو بتا دیا کہ اب وقت آ گیا تھا کہ وہ ایسا کام دیکھے جس میں اُسے بچت زیادہ ہو کیوں کہ ویگن جو دے رہی تھی اِس سے زیادہ نہیں دے سکتی تھی۔ رفیق نے بھی اُس کے ساتھ اتفاق کیا اور یہ بھی بتایا کہ اُس نے خود کئی کام بدلے تھے اور ہمیشہ ایسے کام کی تلاش میں رہا جو اُسے زیادہ دے جس کے نتیجے میں وہ ویگن بنانے میں کامیاب ہوا اور اب وہی ویگن اُسے اپنی ترقی میں رکاوٹ لگ رہی تھی۔ اُس نے ویگن بیچ کر ایک بس خریدنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ قیمت میں فرق وہ اپنی بچت ڈال کے اور بھائی فقیر حسین سے سود پر قرض لے کے پورا کرے گا۔ اُس نے فیاض کو مشورہ دیا کہ جب تک بس نہیں خرید لی جاتی وہ اُس کے ساتھ کام کرے اور اِسی دوران میں وہ اُس کے لیے کوئی بہتر کام ڈھونڈے گا۔ جب یہ طے پا گیا تو فیاض کو تسلی ہوئی اور اُسے محسوس ہوا کہ وہ ایک دم آزاد ہو گیا ہے۔ وہ جان گیا تھا کہ اب اُسے آگے بڑھنے کی ضرورت تھی۔ فیاض نے اپنی ماں کو اِس نئی صورتِ حال کے متعلق بتانا قبل از وقت

سمجھا۔ وہ جانتا تھا کہ ماں نے اُس کے راستے میں رکاوٹ کھڑی کرنے کی کوشش کرنی ہے۔
انتظار کرنا ہی اُسے واحد حل لگا۔

عظمت کے ساتھ اپنے تعلق کا بتانے کے بعد رفیق اب فیاض کے قریب ہو گیا تھا۔ پہلے وہ اُس کے ساتھ اپنایت کا تعلق رکھنے کے باوجود دوری پر تھا۔ کسی وجہ سے جب وہ ویگن میں بیٹھے ہوتے تو رفیق ہمیشہ خاموش بیٹھا سامنے دیکھتا رہتا تھا۔ اب فیاض جان گیا تھا کہ وہ خاموش بیٹھا اپنے اور عظمت کے درمیان میں فاصلے ناپتا رہتا ہے۔ اُس دِن کے بعد اُس نے عظمت کی کبھی بات نہیں کی تھی لیکن وہ کسی نا کسی منصوبے کے متعلق اُسے بتاتا رہتا۔ وہ فیاض کو اعتماد میں تو نہیں لیتا تھا لیکن یہ بتاتا رہتا کہ وہ جلد ہی اُس کے لیے کوئی بہتر کام ڈھونڈ نکالے گا۔ اُس کے لیے کئی لوگوں کے ساتھ رابطے میں تھا اور جیسے ہی کوئی مناسب روزگار نظر آئی وہ بھائی فقیر حسین کے ساتھ مشورے کے بعد اُسے وہاں لگا دے گا۔ فیاض کے لیے یہ باعثِ اطمینان تھا کہ وہ دونوں اُس کے لیے پریشان تھے۔ اِس بات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے وہ بھی ملازمتوں کے بارے میں جاننے کی کوشش نا کرتا اور صرف اتنا ہی کہتا کہ اُن لوگوں کے ہوتے ہوئے اُسے اپنے بارے میں کوئی خاص فکر نہیں۔

جب سے اُسے زندگی کی باریکیوں کا احساس ہوا تھا، اُسے اپنی ماں پہلی دفعہ مطمئن اور خوش لگی۔ فیاض جانتا تھا کہ وہ صحن میں گھر کے چھوٹے موٹے کام کرتے ہوئے گنگناتی رہتی ہے جب کہ کچھ عرصہ پہلے تک وہ اُس کی بڑبڑاہٹ سے کبھی اُکتا بھی جاتا تھا۔ وہ یہ بھی سمجھتا تھا کہ ماں کی کسی بات، فعل یا عمل کے بارے میں ناخوش گوار رائے رکھنا ایک طرح سے گناہ ہی تھا۔ گناہ کیا ہے؟ وہ جو ڈیرے والے کر رہے ہیں؟ یا جواب میں جو اُن کے خلاف کیا جا رہا ہے؟ یا وہ جو وہ رفیق کے ساتھ کر رہا تھا؟ یا وہ جو بھائی فقیر حسین کی بیوی نے کیا؟ یا وہ جو رفیق کے ساتھ عظمت کی ماں نے کیا؟ وہ ایسی ہی باتیں سوچتے رات کو جاگتے ہوئے سو جاتا اور جب کبھی آنکھ کھلتی تو یہی کچھ سوچتے ہوئے کوئی حل نکالنے کی کوشش کرتا۔

فیاض کو اب رفیق کی ویگن کے ساتھ دل چسپی نہیں رہی تھی۔ اُس نے جب چند کرائے مارنے شروع کیے تو اُسے ایک طرح احساس جرم رہتا اور اب وہ سوچتا کہ زیادہ پیسے اکٹھے کرنا اُس کا حق تھا۔ بھائی فقیر حسین گاؤں میں ایک ذیلی قسم کی غلہ منڈی بنا کے خود آڑھتی بننا چاہتا تھا اور یہ

بات کسی سے ڈھکی چھپی نہیں تھی کہ آڑھتی کسان کا اُتنا ہی خون چوستے ہیں جتنا کہ زمین دار اور رفیق کے لیے ویگن اب آمدنی کا ایک چھوٹا ذریعہ تھی اور اُس کا ارادہ بس بنانے کا تھا۔ وہ ایک طرح سے دونوں کا شراکت دار تھا لیکن اُس کے مستقبل کی کنجی وہ ہی سنبھالے ہوئے تھے۔ فیاض نے سوچا کہ اب اُسے اپنا ایک الگ راستہ چننا چاہیے۔

فیاض ویہڑے میں اپنے گھر کو دیکھتا تو وہ احساسِ کمتری میں مبتلا ہو جاتا۔ ڈیرے والوں کے گھر ایسے نہیں تھے کہ اُنھیں گاؤں کی اچھی تعمیروں میں شامل کیا جا سکے لیکن وہ اُس کے گھر سے یقیناً آرام دہ تھے۔ اُنھیں یہ دعا نہیں مانگنا پڑتی تھی کہ بارش نا ہو کیوں کہ اُن کے پاس اتنے برتن نہیں تھے کہ وہ ٹپکتی چھتوں کے نیچے رکھ سکیں اور چھت کے گرنے کے خوف سے بے دھڑک ہو کے سوئے رہیں۔ وہ سوچتا کہ اُسے گھر کو اتنا محفوظ اور آرام دہ بنانا ہے کہ اُس کے گرنے کا دھڑکا نا رہے۔ گھر کی تعمیر نو کے لیے پیسوں کی ضرورت تھی جو اُس کے پاس نہیں تھے اور اُس کی زرعی ملکیت پر ڈیرے والوں کا قبضہ تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اِس وقت وہ اُن سے اپنی زرعی ملکیت واپس نہیں لے سکتا۔ ایسا کرنے کے لیے اُس کے پاس دولت کے ساتھ ساتھ قانونی اور افرادی طاقت بھی چاہیے تھی۔ ماں بار بار کہتی رہتی تھی کہ وہ اُس کی جان کے دشمن تھے اور اُنھیں اُس کا اپنا ایک الگ حلقہ بنانا پسند نہیں آ رہا تھا۔ وہ اِس معاملے پر اکثر سوچتا رہتا اور اُسے کبھی کبھی ماں کا نقطہ نظر درست بھی لگتا۔ انھوں نے صرف اُسے ٹھکانے لگانا تھا اور جب وہ ایسا کرنے میں کامیاب ہو جاتے تو ماں اُن کے لیے کوئی رکاوٹ نہیں رہنا تھی۔ اُسے خیال آتا کہ اگر ایسے ہو جائے تو زندہ ماں نے ڈیرے والوں کے لیے سودمند ہونا تھا۔ وہ ماں کو خوف کی ایک انتہائی حالت میں دیکھ سکتا تھا جہاں وہ شکست خوردہ اور اُن کے رحم و کرم پر تھی۔

فیاض ماں کو خوش اور مطمئن دیکھنا چاہتا تھا اور وہ اُسے خوش اور مطمئن لگ رہی تھی۔ اُس نے اُس کے بازوؤں میں کبھی چوڑیاں اور کانوں میں کبھی بندے یا کانٹے نہیں دیکھے تھے۔ وہ ویگن میں سوار ہوتی عورتوں اور لڑکیوں کو دیکھتا تو اُس کی سوچ میں ایک تیز دھار آلہ کھُب جاتا کہ اُن کے بازوؤں میں چوڑیاں ہوتیں اور کانوں میں بھی کچھ نا کچھ ہوتا۔ ایک رات کھانا کھاتے ہوئے اُس نے ماں کو چوڑیاں پہننے کا کہا تو وہ خاموش ہو گئی۔ فیاض نے کچھ دیر اُس کے جواب کا انتظار کیا اور پھر اندازہ لگایا کہ ماں نے اُس کا سوال سنا نہیں۔ اُس نے سوال دہرایا تو اُسے ماں کی

سسکی سنائی دی۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ بیوائیں چوڑیاں نہیں پہنتیں۔ ماں نے اُسے یہ بتایا نہیں لیکن نظر جھکائے اپنے آنسو کبھی بہاتی اور کبھی روکتی رہی۔ فیاض نے فیصلہ کرلیا کہ وہ اگلے دِن شہر سے ماں کے لیے چوڑیاں لا کے اُسے خود پہنائے گا۔ ماں کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن فیاض نے ایک دم باتیں کرنا شروع کر دیں۔ اُسے ماں کے بات کرنے کے ارادے کے بارے میں علم نہیں تھا ورنہ وہ اُس کی بات ضرور سنتا۔ وہ تو بس بولے جارہا تھا۔ کبھی وہ کسی سواری کے چلتی ویگن میں سے اُترنے کی کوشش میں چوتڑوں پر گرنے کا واقع سناتا اور پھر خود ہی اُس بات سے لطف اندوز ہوتا۔ وہ کبھی کسی کے کھڑی بس میں سوار ہوتے ہوئے کسی کی گود میں گر جانے کا واقع سناتا اور قہقہے لگا کے ہنستے ہوئے مزید کچھ سناتا۔ وہ جب سونے کے لیے جانے کے لیے اُٹھا تو اُس کی ماں نے روک لیا۔ وہ ماں کے بات کرنے کے انتظار میں کچھ دیر کھڑا رہا جب کہ ماں چولھے کو بجھا کے برتن سمیٹنے لگی۔ وہ اپنے کام میں مصروف تھی اور فیاض کو ایسے لگا کہ اُس نے بے خیالی میں ہی اُسے روک لیا ہے۔ وہ جانے لگا تو ماں نے پھر اُسے روک لیا:

''کل میرے لیے چوڑیاں لانا۔''

فیاض کہنا چاہتا تھا کہ اُسے کیسے پتا چل گیا کہ اُس نے چوڑیاں لانے کا پہلے ہی فیصلہ کرلیا ہے؟ پھر وہ خاموشی کے ساتھ وہاں سے ہٹ گیا اور اُسے ماں کی آہ سنائی نا دی۔

اگلا دِن بھی اُن کئی دنوں کی طرح تھا جو اُس دِن کی طرح معمول کے مطابق تھے۔ اڈے پر پہنچنے کے بعد اُس نے ویگن کو جھاڑا، ٹاپا اُٹھا کر پانی، موبل آئیل اور بریک آئیل دیکھا اور رفیق کو بتائے بغیر بازار چوڑیاں لینے چلا گیا۔ اُسے چوڑیوں کے رنگوں کی پہچان نہیں تھی، وہ رنگ دیکھتے ہوئے فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ دکان دار اُس کی مدد کو آ گیا۔ وہ فیاض کی عمر دیکھ کے اندازہ لگا چکا تھا کہ اُسے چوڑیاں ماں یا بہن یا بھابھی کے لیے چاہئیں ہوں گی اور یا پھر کسی پڑوسن کے لیے، یقیناً بیوی کے لیے نہیں۔ دکان دار کے استفسار پر اُس نے بڑے فخر کے ساتھ بتایا کہ اُسے ماں کے لیے تحفہ چاہیے۔ دکان دار نے کئی رنگوں کی چوڑیوں کا ایک گچھا بنا کے فیاض کے حوالے کر دیا۔

کھانا ختم کر کے فیاض نے پیڑھی کے نیچے چھپا کے رکھا ہوا چوڑیوں والا لفافہ نکال کے ماں کو دیا۔ ماں نے پھر ایک آہ بھری۔ ''بیوہ چوڑی نہیں پہنتی، وہ تو اپنے بازو ننگے رکھتی ہے۔ میں

اب بیوہ نہیں رہی۔ جس بیوہ کا بیٹا جوان ہو جائے وہ سہاگن ہو جاتی ہے۔لو مجھے پہناؤ۔'' ماں نے دائیاں ہاتھ آگے بڑھایا تو فیاض کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔اُس نے آنسوؤں کی ترمراہٹ میں ماں کے چوڑیاں پہنائیں۔ایک چوڑی ٹوٹی بھی جس کی نوک سے ہلکی سی خراش بھی آئی اور خون کا ایک قطرہ بھی نکلا جسے فیاض نے اپنے ہاتھ سے صاف کیا۔تھوڑی کوشش کے بعد ماں کے دونوں بازوؤں میں چوڑیاں تھیں اور وہ مسکراتے ہوئے آہیں بھرتی تھی اور آہیں بھرتے ہوئے مسکراتی تھی۔

فیاض کے معمول میں کوئی تبدیلی نہیں تھی۔گاؤں کے اڈے سے شہر اور پھر گاؤں، شہر اور واپس گاؤں۔اُس دِن بادل تھے، ہوا مند مند تھی اور برفیلی ٹھنڈ نے پورے اڈے کی رونق کو اُداسی میں بدل کے رکھا ہوا تھا۔ویگن کا انجن چل رہا تھا، ہیٹر نے ویگن کے اندر ایک سکون کر رکھا تھا اور وہ دونوں خاموش بیٹھے ہوئے تھے۔رفیق اپنے بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کر رہا تھا اور فیاض کو وہ بے چین لگا اور اُس کے ذہن میں ایک پرانی یاد گھوم گئی جب دونوں اِسی طرح ویگن میں بیٹھے تھے اور رفیق اِسی طرح پریشان اور بے چین تھا اور پھر اُس نے اپنی زندگی کے اہم حصے پر سے پردہ اُٹھایا تھا۔آج بھی رفیق کی وہی حالت تھی۔فیاض کو رفیق پر ترس آیا کہ وہ ابھی تک عظمت کو بھولا نہیں تھا اور اُسے ایک تجسس نے بھی اُکسانا چاہا کہ وہ رفیق سے اُس کی بے بسی کی وجہ جانے لیکن اُس نے تمام زندگی ایک انجانے خوف کے تلے دبے گزاری تھی اور اُسی خوف کی توسیع وضعداری تھی جسے فیاض ہر وقت تھامے رکھتا کہ مبادہ کچھ ایسا ہو جائے جو نہیں ہونا چاہیے تھا۔وہ رفیق کی بے چینی کی وجہ جاننے کے لیے بے چین تھا ہی جب کہ وہ وجہ جانتا تھا لیکن پوچھنے سے خائف تھا۔

''میں ایک بار عظمت کے گھر کو دیکھنا چاہتا ہوں۔میں اُس گھر کو دیکھنا چاہتا ہوں جہاں اُس نے اور میں نے ایک دوسرے کو قبول کیا اور اب جہاں وہ کسی اور کے ساتھ رہ رہی ہے۔میں نے طے کیا ہوا تھا کہ وہ گھر کبھی نہیں دیکھوں گا لیکن میرے اندر حسد کا ایک ناگ اپنا پھن پھیلا رہا ہے۔تم نے کبھی پھنئیر سانپ دیکھا ہے؟'' رفیق نے پوچھا۔فیاض اُس کی باتوں میں اتنا گم تھا کہ جواب دینے کے بجائے وہ ایک سکتے میں آ گیا۔اُسے رفیق اپنی طرف گھورتا ہوا محسوس ہوا تو وہ کچھ کھسیانہ اور کچھ خوف زدہ اُس کی طرف دیکھنے لگا۔فیاض نے اپنے آپ پر قابو پایا اور جلدی سے نفی میں سر ہلایا۔''پھنئیر سانپ سیاہ کالا ہوتا ہے اور جب اُسے غصہ آئے تو وہ اپنا سر اُٹھا لیتا ہے اور

ایسے لگتا ہے کہ اُس نے بادشاہوں والا تاج پہنا ہوا ہے۔ میرے اندر حسد کا وہ پھنئیر اپنا سر اُٹھا رہا ہے۔ پھنئیر بہت زہریلا ہوتا ہے اور اُس کا کاٹا ہوا بچتا نہیں۔ حسد کا پھنئیر مجھے ڈس رہا ہے میرے بچنے کی کوئی اُمید نہیں ہے۔ سو میں نے زندہ رہنے کے لیے وہ دروازہ ایک نظر دیکھنے کا فیصلہ کیا ہے۔ چلو میرے ساتھ۔"

فیاض کے اندر کم اعتمادی، تجسس، خوشی اور بے یقینی کی لہر دوڑ گئی۔ وہ جانے کے لیے بے چین تو تھا ہی لیکن رفیق کو روکنا بھی چاہتا تھا کہ اگر اُس کا عظمت کے ساتھ آمنا سامنا ہو گیا؟ اُس نے عظمت کو دیکھا نہیں ہوا تھا۔ اگر دیکھا ہوتا تو یقیناً بھائی فقیر حسین کی کتاب اُس کے کام آتی۔ وہ عظمت کو دیکھتے ہی اُس کے بارے میں سب کچھ جان جاتا۔ اُس نے رفیق کے تقاضے کا جواب تو نہیں دیا لیکن اُس کے اشارے کے انتظار میں اُٹھنے کے لیے تیار ہو گیا۔

رفیق نے ہیٹر اور انجن بند کیا تو فیاض نیچے اُتر گیا۔ ٹھنڈ کے پہلے تھپیڑے نے ہی اُس کے اندر ایک کپکپی دوڑا دی اور اُس نے اپنی بکل کو مزید تنگ کر دیا۔ وہ ایک بڑے بازار میں سے گزر کے ایک چھوٹے بازار میں گئے اور پھر ایک کھلی گلی میں مڑ گئے جہاں بچے کرکٹ کھیل رہے تھے۔ وہ کچھ دیر اُن بچوں کو دیکھتے رہے اور فیاض کا جی اُن کے ساتھ شامل ہونے کو کر آیا۔ بچوں کو اُن کو دیکھنا دخل در معقولات لگا اور پھر وہ اپنی کھیل میں مشغول ہو گئے۔ فیاض کو اُن بچوں کی خود اعتمادی اور بے فکری دیکھ کے اپنے آپ پر ترس آیا۔ وہ ایسی کوئی کھیل نہیں کھیلا تھا کیوں کہ ڈیرے والوں کا سایہ ہمیشہ اُسے روشنی میں جانے سے روکے رہا تھا۔ وہ تھوڑا آگے گئے اور رفیق رُک گیا۔ رفیق کے چہرے پر اچانک خوشی کی روشنی پھیل گئی۔ اُس نے شرماتے ہوئے آنکھ کے اشارے سے ایک دُروازے کی طرف اشارہ کیا۔ فیاض سمجھ گیا کہ عظمت اُسی دروازے کے پیچھے رہتی ہے۔ اُس نے رفیق کی طرف دیکھا۔ یہ وہ نظر تھی جس سے وہ آواز دیے بغیر رفیق کو ویگن چلانے کا کہتا تھا۔ رفیق اُس کا پیغام سمجھ کے ہلکے سے مسکرایا اور فیاض اعتماد کے ساتھ دروازے کی طرف چل پڑا۔ فیاض کو اپنے اعتماد پر حیرت ہو رہی تھی۔ اُس نے سوچا ہی نہیں تھا کہ وہ دروازہ کھولنے والوں سے کیا بات کرے گا؟ وہ بس دروازہ کھلوانا چاہتا تھا۔ جب فیاض دروازے کی طرف بڑھا تو رفیق نے بڑھ کے اُسے روکنا چاہا، اُسے آواز دینا چاہی لیکن وہ ایسے کر نا سکا اور فیاض اعتماد سے چلتے ہوئے دروازے تک پہنچ گیا۔ اُس نے مڑ کے بھی نہیں دیکھا کہ رفیق اُسے اشارے سے ہی روک دیتا۔

فیاض نے دروازہ کھٹکھٹایا تو رفیق نے ادھر اُدھر دیکھا کہ کوئی رکاوٹ اُسے چھپا لے۔ وہ کھلی گلی میں کھڑے تھے اور پیچھے بچوں کے کھیلنے کا شور تھا۔ فیاض کو دور کہیں سے قدموں کی آواز آئی۔ وہ قدم نا تو تھکے ہوئے تھے اور نا ہی اُن میں تازگی کی لچک تھی۔ کوئی اُنھیں گھسیٹ رہا تھا اور وہ گھسٹتے ہوئے نزدیک آ رہے تھے۔ دروازہ کھلا تو وہاں بھائی فقیر حسین کی بیوی کی عمر کی ایک عورت کھڑی تھی جو اُس کی طرح تازہ تو نہیں تھی لیکن اُس سے خوب صورت تھی۔ پیچھے سے آواز آئی:

''کون ہے؟'' اُس آواز میں عمر کی کرختگی تھی جس سے فیاض کچھ خائف بھی ہوا۔

''ایک لڑکا ہے!'' آواز میں مٹھاس کے ساتھ بے زاری بھی تھی۔

''کون لڑکا؟''

''پوچھ کے ہی بتا سکتی ہوں۔'' اِس بار آواز میں مٹھاس کے بجائے غصہ تھا۔ اُس عورت نے فیاض کی طرف دیکھا۔ فیاض نے اپنا تعارف کروانے کے بجائے رفیق کی طرف اشارہ کیا۔ عورت کا چہرہ ایک دم خوشی کی مسکراہٹ میں ڈھل گیا اور پھر اُس کا رنگ سفید ہو گیا۔ اُس نے اپنے آپ کو سنبھالنے کے لیے چوکھٹ کا سہارا لیا۔ اُس کو اِس طرح بے بس دیکھ کے فیاض بھی پریشان ہو گیا لیکن پھر اُس عورت نے اپنے آپ پر قابو پا لیا۔ وہ اب مسکرائی۔ فیاض نے گلی کے دوسری طرف کھڑے رفیق کو دیکھا۔ رفیق کے چہرے پر نا تو کوئی خوشی تھی اور نا ہی تکلیف؛ وہ وہاں بے بس سا کھڑا اُن کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔ فیاض کو اُس پر ترس آیا اور اُس نے عورت کو پھر غور سے دیکھا۔ دوسری مرتبہ دیکھنے کے بعد وہ اُسے پہلے سے زیادہ خوب صورت لگی۔ ''رفیق آیا ہے۔ یاد ہے نا جو مشینوں پر کام کیا کرتا تھا۔'' عورت نے لاتعلقی کے ساتھ صحن کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ فیاض کو حیرانی ہوئی کہ کیا یہ وہی عورت تھی جسے خود کو سنبھالنے کے لیے دروازے کا سہارا لینا پڑا تھا؟ اُس عورت نے پھر رفیق کی طرف دیکھا اور ایک آہ بھری۔ ''میں اُسے بیٹھک میں لے کے جا رہی ہوں۔'' عورت واپس چلی گئی اور تھوڑی دیر کے بعد گلی میں کھلنے والے دوسرے دروازے کی کنڈی کھولے جانے کی آواز آئی۔ اُس عورت نے سر باہر نکالا کے فیاض کو اندر آنے کا اشارہ کیا اور وہ دونوں بیٹھک میں چلے گئے۔

''کوئی بھی تبدیلی نہیں!'' رفیق نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے بات شروع کی۔ وہ کچھ

گھبرایا ہوا تھا لیکن اُس کی آواز میں ایک ٹھہراؤ تھا۔ رفیق ایک کونے میں پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا۔

''وہاں نہیں یہاں بیٹھو۔'' اُس نے رفیق کو ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ رفیق کسی جانور کی طرح اپنے کھونٹے پر جا بیٹھا۔ ''ہاں! کوئی تبدیلی نہیں۔ اِس کے علاوہ سب کچھ بدل گیا۔'' عورت نے اطمینان سے جواب دیا۔ فیاض کو عورت کا لہجہ مصنوعی لگا بالکل وہی لہجہ جس میں اُس کی ماں نے اُسے چوڑیاں لانے کو کہا تھا۔

''مالک؟'' رفیق کی آواز میں خوف تھا۔

''اُسی طرح۔ دیکھنا چاہو گے؟'' عورت کی آواز میں طنز تھا۔

''جلی ہوئی بات کیوں کرتی ہو؟'' رفیق نے غصے سے کہا۔ فیاض کو رفیق کبھی غصے میں نظر نہیں آیا تھا۔

''جلی ہوئی بات کرتی ہوں؟ نہیں تو! ابا جی ویسے ہی ہیں اور میں بھی ویسے ہی۔'' اب عورت کے لہجے میں کسی حد تک مٹھاس تھی۔ اُس نے پہلی مرتبہ فیاض کی طرف دیکھا۔

''اور تمھارا خاوند؟ اور والدہ؟'' رفیق نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

''میں نے شادی سے انکار کر دیا تھا۔ میں نے ابھی تک شادی نہیں کی۔ والدہ ٹھیک ہیں۔ چائے پیؤ گے؟'' اُس نے فیاض سے پوچھا۔

''مجھے کیوں نہیں پوچھا؟'' رفیق کے چہرے پر ایک دم رونق آ گئی تھی۔ وہ اچانک اُٹھ کھڑا ہوا۔ ''چائے میں بھی پیوں گا پہلے مالک کو دیکھ آؤں۔'' اُس نے فیاض کی طرف دیکھا۔ ''تم بیٹھو۔'' پھر وہ عورت کی طرف مُڑا ''چل عظمت!'' فیاض کو رفیق کے اعتماد پر حیرت ہوئی۔ وہ دونوں اُسے اکیلا چھوڑ کے اندر چلے گئے۔ فیاض کو یک دم یاد آیا کہ اُن کے واپس جانے کا وقت ہو چکا ہے۔ رفیق شاید اپنے معاملات بھول ہی گیا تھا کہ اُنھوں نے لوگوں کو اُن کے گھروں تک واپس پہنچانا ہے اور جلد ہی دھند بھی پڑنا شروع ہو جائے گی۔

تھوڑی دیر کے بعد رفیق بیٹھک میں آ گیا۔ اُس نے بتایا کہ وہ چائے سے منع کر آیا ہے اور عظمت کے آنے کے بعد وہ اُٹھ جائیں گے۔ عظمت جب آئی تو وہ مسکرا رہی تھی۔ رفیق بھی اُسے دیکھ کے مسکرائے جا رہا تھا۔ فیاض کو اُن دونوں کے پاس کھڑے ایک اُلجھن ہو رہی تھی۔ وہ

کچھ کہے بغیر باہر گلی میں آ گیا۔ بچوں کے کھیلنے کی آوازیں آنا بند ہو گئی تھیں۔ باہر آتے ہی فیاض کو سردی کا احساس ہوا اور اُس نے ہاتھ ملنا شروع کر دیے۔ رفیق نے باہر آ کے اُس کی طرف مسکراتے ہوئے دیکھا۔ فیاض کو لگا کہ اُسے جانے کی جلدی نہیں۔ وہ کچھ دیر خاموش کھڑے رہے۔ ''اگر ہم نا آتے تو پتا نہیں کیا ہو جاتا یا شاید کچھ بھی نا ہوتا۔ وہ انتظار کرتی رہتی اور میں حسد کے ناگ کے بار بار ڈسنے کے درد کو سہتا رہتا۔'' فیاض نے جواب نہیں دیا۔ اُسے اڈے پر پہنچنے کی جلدی تھی۔ ٹھنڈ اُس کے بدن میں داخل ہونا شروع ہو گئی تھی۔ ''تمھیں کیسی لگی؟'' رفیق نے فیاض کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور وہ اڈے کی طرف چل پڑے۔ پھر رفیق نے پیچھے مڑ کے دیکھا اور رُک گیا۔ ''دروازے میں کھڑی ہے۔'' لیکن فیاض رکا نہیں اور رفیق بھی چل پڑا۔ فیاض کو رفیق کا عظمت کے ساتھ ملنا اچھا لگا تھا اور اُسے خوشی تھی کہ اُس نے یہ ملاپ دیکھا، دونوں کے چہروں پر سکون میں ڈوبی ہوئی مسکراہٹیں دیکھیں لیکن اب وہ وہاں رکنا نہیں چاہتا تھا، اُسے انتظار میں اِدھر اُدھر بیٹھے ہوئے مسافروں کی پریشانی تھی۔ ''میں حسد کی آگ میں جل رہا تھا۔ میں سوچتا رہتا تھا کہ وہ اپنے خاوند کے ساتھ راتوں کو ننگی سوتی ہو گی۔ میں اُس کو روک نہیں سکتا تھا لیکن مجھے یہ اپنی ایک بزدلی محسوس ہوتی۔ ہم شاہد پیدا ہی بزدل ہوتے ہیں۔ فقیر حسین جتنی بھی باتیں کرے وہ ڈیرے والوں کے سامنے اُن کی ہاں میں ہاں ملاتا ہے۔ ہم سازش کر کے اُنھیں شکست دے سکتے ہیں لیکن سینہ تان کے اُنھیں مقابلہ کرنے کا نہیں کہہ سکتے۔ میں جانتا تھا کہ وہ اپنے خاوند کے ساتھ ننگی سوئی ہوئی بھی میری ہے لیکن میرے اندر اُس کا دعویٰ دار بننے کی ہمت نہیں تھی۔'' اب وہ بچوں کے کھیلنے والی جگہ پر پہنچ چکے تھے۔ ایک تھڑی پر چند بچے بیٹھے کھیل پر تبصرہ کر رہے تھے۔ اُن کی آوازیں دبی دبی لیکن لہجوں میں شدت تھی۔

''مالک کا کیا حال تھا؟'' فیاض پہلی مرتبہ بولا۔

''ہاں مالک! جس طرح میں نے تب دیکھا تھا بالکل اُسی طرح۔ سیدھا لیٹا چھت کو دیکھے جاتا تھا، اُس کی نظریں خالی تھیں اور چہرہ بے تاثر۔ عظمت کی ماں بتا رہی تھی کہ اِس مرض کے مریضوں کی عمر کافی لمبی ہوتی ہے۔ ہماری دعا ہے کہ اُس کے لیے جو بہتر ہے وہ ہو۔ دکھ کی بات یہ ہے کہ وہ چاہتی تھی کہ مالک مر جائے۔'' ابھی اندھیرا تو نہیں ہوا تھا لیکن سردیوں کی شام کا جذباتی قسم کا سایہ ہر شے پر قابض محسوس ہوتا تھا۔ ''کیسی لگی؟'' رفیق نے اچانک موضوع بدلا۔

فیاض کے لیے یہ سوال غیر متوقع تھا۔ پہلے تو اُس نے ظاہر کیا کہ اُس نے کچھ سنا ہی نہیں ، پھر اُسے جواب نا دینا عظمت کی بے عزتی لگا۔ کیا وہ بھی کہیں بھائی فقیر حسین کی بیوی کی طرح اُس لڑکے کو پسند تو نہیں کرتی تھی جو اُس کی عمر کا تھا۔ اُس کے ذہن میں ، اُس کھلی گلی میں چلتے ہوئے ، بھائی فقیر حسین کی بیوی کے جسم کی تازہ خوشبو جاگ اُٹھی اور اُسے یاد آیا کہ عظمت نے اُس سے اپنایت کے ساتھ چائے کا پوچھا تھا۔ اُسے اچانک اپنے آپ سے خوف سا محسوس ہوا۔ وہ کیا جواب دے؟ وہ چلے جا رہے تھے اور رفیق اُس کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرا رہا تھا۔ وہ جان گیا کہ رفیق کو کس جواب کی توقع تھی؟ فیاض نے ظاہر کیا کہ وہ کچھ سوچ رہا ہے۔

''بہت اچھی۔'' اُس نے سامنے دیکھتے ہوئے کہا۔ اُس نے سوچا کہ وہ تھی ہی اچھی جو اتنے سال رفیق کے واپس آنے کا انتظار کرتی رہی۔ ''تم اب کیا کرو گے؟'' فیاض کے اندر اچانک ایک آدمی جاگ اُٹھا۔ وہ چاہتا تھا کہ گاؤں میں دو عورتیں ہو جائیں جو اُسے ساتھ لگائیں اور وہ اُن کے ساتھ لگ کے خوب روئے۔

رفیق نے جواب دینے کے بجائے قہقہہ لگایا۔ ''تم بتاؤ؟''

فیاض کو لگا کہ وہ اُس کے ساتھ اب ایسا کھیل کھیل رہا تھا جو بڑے ، بچوں کے ساتھ کھیلتے ہیں۔ اُسے رفیق کا یہ سوال پسند نہیں آیا۔

اب وہ بازار میں تھے اور لوگ دکانوں کا آخری چکر لگا رہے تھے۔ فیاض خاموشی کے ساتھ چلتا رہا۔ رفیق بھی شاید اُس کی خاموشی کا مطلب سمجھ گیا تھا۔ ''میں اُس کے ساتھ شادی کروں گا۔ میں شادی کے بعد اُسے گاؤں میں اپنے گھر لے جانا چاہوں گا۔ میں یہاں نہیں رہ سکوں گا۔ اُس نے میرے لیے قربانی دی اور مجھ سے بھی قربانی کی توقع رکھے گی لیکن میں گاؤں میں رہنا چاہوں گا جہاں ہم نے اپنے مقصد کو لے کے آگے چلنا ہے۔ وہ نہیں سمجھے گی لیکن تم اور میں اُسے سمجھا لیں گے۔''

فیاض کو رفیق کا اُسے اپنے منصوبے میں شامل کرنا اچھا لگا۔ اُسے اچانک اپنی اہمیت کا احساس ہوا۔ اب وہ جان گیا کہ رفیق اُس کی مدد کے بغیر ویگن نہیں چلا سکتا تھا اور عظمت کو گاؤں میں رہنے کے لیے قائل کرنے کے لیے بھی اُس کی ضرورت تھی۔ ''ٹھیک ہے۔ ہم مل کے اُسے سمجھا لیں گے۔'' فیاض کو اپنے لہجے میں بزرگی کا احساس ہوا۔

اب وہ اڈے میں داخل ہو چکے تھے اور لوگ ویگن کو نظر میں رکھے اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے تھے اور اپنے آپ کو گرم رکھے ہُوئے تھے۔ رفیق نے ویگن سٹارٹ کی اور فیاض نے سواریوں کو آواز دی۔

ماں کے لیے وہ مقامی لنڈے سے پورے بازو کے دو سویٹر اور ایک اون کی چادر لے آیا تھا۔ ماں نے کئی سالوں کے بعد خود کو آرام سے محسوس کیا۔ اب اُسے ماں کے بیوہ ہونے کی محرومی کا احساس ہونے لگا تھا۔ وہ چوڑیاں نہیں پہن سکتی تھی لیکن اُس نے پہن لیں، وہ نہیں جانتا تھا کہ اُس نے ایسا کرتے ہوئے کتنا دشوار گزار پہاڑ سر کیا تھا۔ ڈیرے والے ایک دوسرے کا ہاتھ بٹاتے ہوئے زندگی گزار رہے تھے جب کہ اُس کی ماں اکیلی تھی اور وہ اُس کا واحد سہارا تھا۔ اُس نے سوچا کہ اُسے ماں کے ساتھ کھڑے ہونا ہے؛ اُس کے علم میں آیا تھا کہ ڈیرے والے اُس کی ماں کو ہر معاملے میں غلط ثابت کرنے کی کوشش میں تھے اور اُس نے اُن کی ہر بات کو غلط ثابت کرتے ہوئے اپنی ماں کو درست ثابت کرنا ہے: اُس نے یہ فیصلہ کرلیا تھا کہ وہ اپنی ماں کو ہر وقت درست سمجھے گا۔

دِن چھوٹے تھے اور دھند دیر تک لٹکی رہتی تھی، سواریاں بھی کم سفر کرتی تھیں اِس لیے وہ دونوں جلدی میں نہیں ہوتے تھے۔ رفیق اب بتائے بغیر چند گھنٹوں کے لیے غایب ہو جاتا تھا۔ فیاض کو اندازہ تھا کہ وہ عظمت سے ملنے جاتا ہے۔ فیاض جاننا چاہتا تھا کہ وہ دونوں کیا باتیں کرتے ہیں۔ کیا وہ صرف باتیں کرتے ہیں یا کچھ اور بھی؟ اُسے کھد بد رہتی لیکن وہ انتظار میں بھی تھا کہ رفیق خود بتائے۔ انتظار کرتے رہنے کے بعد ایک دِن فیاض نے پوچھ ہی لیا۔ رفیق نے پہلے حیرانی کے ساتھ فیاض کی طرف دیکھا اور پھر قہقہہ لگا کے ہنس پڑا۔ ''تم کیا سمجھتے ہو؟'' اُس نے پوچھا۔ اِس سوال سے فیاض کو گھبراہٹ ہوئی اور شرمساری بھی کہ ایسا ذاتی قسم کا سوال اُس نے کیوں پوچھا؟ وہ عظمت کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا تھا اور نا ہی اُس نے کبھی جاننا تھا، یہ تو صرف رفیق کے اپنا راز کھولنے سے ہی اُسے معلوم ہوا۔ رفیق، عظمت کا پہلی بار پتا کرنے اکیلا بھی جا سکتا تھا اور ممکن تھا کہ اگر وہ ساتھ نا ہوتا تو وہ اُس کے جانے بغیر ابھی تک عظمت کے ساتھ خفیہ ملاقاتیں کر رہا ہوتا۔ اُسے اپنی جلد بازی پر غصہ بھی آیا اور اپنے متجسس ہونے سے قدرے اطمینان بھی۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ وہ دونوں کرتے کیا ہیں؟

رفیق مسکراتے ہوئے فیاض کو دیکھے جا تا تھا اور فیاض مسکراہٹ کو چھپاتے ہوئے سامنے۔ ''تم کیا سمجھتے ہو؟'' رفیق نے پھر پوچھا۔ اب وہ مسکراتو نہیں رہا تھا لیکن دل چسپی سے اُسے دیکھے ضرور جارہا تھا۔

''مجھے کیا پتا۔'' فیاض نے سوچتے ہوئے بات شروع کی۔ ''اگر مجھے پتا ہوتا تو پوچھتا ہی کیوں؟'' وہ کچھ دیر کے لیے خاموش ہوا۔ رفیق اُس کے بات جاری کرنے کے انتظار میں اُسے دیکھے جارہا تھا۔ فیاض نے سوچا: اُسے غلط بات نہیں کرنی چاہیے۔ رفیق اور اُس کے تعلق میں ،سوائے چند کرائے پار کرنے کے، کچھ بھی اولھے میں نہیں تھا۔ اِس بار فیاض ہنسا، ''مجھے صرف یہ تھا کہ تم لوگ باتیں کرتے ہو یا کچھ اور بھی.....!'' یہ اتنا اچانک تھا کہ پُہلے ایک دم خاموشی ہوگئی اور پھر دونوں ہنسنے لگ پڑے۔

''وہ نہیں مانتی۔'' رفیق نے سنجیدگی سے کہا۔ فیاض کو اپنے کان سرخ ہوتے محسوس ہوئے۔ اُس نے انگلیوں کی پوروں سے ایک کان کو محسوس کیا کہ وہ جل تو نہیں رہا؟ اُسے ایسا کچھ محسوس نہیں ہوا۔ رفیق نے ایک لمبی ساری سانس لی۔ ''عجیب عورت ہے۔''

''کیوں؟'' فیاض نے بے ساختگی سے پوچھا۔ اُسے تجسس تو پہلے ہی تھا اب وہ کچھ بے چین بھی ہو گیا۔ وہ اب سب کچھ جاننا چاہتا تھا۔ وہ عظمت کو دیکھ چکا تھا، اُس کے حالات کے ساتھ اُس کی واقفیت ہو چکی تھی اور سب کچھ جاننا اُسے اپنا حق لگا۔

''کہتی ہے کہ میں نے اتنا انتظار کیا ہے کہ میرے اندر کی ہر خواہش ختم ہوگئی ہے۔ وہ میرے ساتھ جُڑ کے بیٹھتی ہے اور بس۔'' فیاض کا دِل تیزی کے ساتھ دھڑکنے لگا۔ اُسے ڈر تھا کہ رفیق اُس کے چہرے کے تاثرات سے اُس کی بے چینی کی وجہ نا جان جائے۔ فیاض کو جُڑ کے ساتھ بیٹھنا بھی عجیب لگا۔ وہ ایک بار بھائی فقیر حسین کی بیوی کے ساتھ لگا تھا تو اُس کے آنسو بہہ نکلے تھے۔ کیا ساتھ جڑنے سے آنسو بہنا شروع ہو جاتے ہیں؟

''تم روتو نہیں پڑتے؟'' فیاض نے معصومیت سے پوچھا۔

''رونا کیوں ہے؟'' رفیق نے سوچتے ہوئے جواب دیا۔ ''وہ کہتی ہے کہ مجھے یاد کرتے ہوئے وہ مجھے ملنے سے زیادہ خوش تھی۔ اُس وقت اُسے ایک اُمید نے زندہ رکھا ہوا تھا۔ اب وہ مجھے یاد نہیں کرتی، میں خود ہی اُس کے پاس چلا جاتا ہوں۔ اب وہ مجھے محسوس کرتی ہے اور میں اُس

کے ساتھ ہوتا ہوں، بہت ہی قریب۔ یہی وہ چاہتی ہے۔"

فیاض کچھ دیر رفیق کی بات پر غور کرتا رہا۔ اُسے نا تو کچھ سمجھ آئی اور نا ہی کسی نتیجے پر پہنچا۔ اُسے مایوسی ہوئی۔ اُس کا خیال تھا کہ وہ کوئی دل چسپ قسم کا واقعہ سنے گا۔ "وہ چاہتی کیا ہے؟" اُس نے مایوسی اور تھوڑی سی برہمی سے پوچھا۔

"شادی ہو جائے تو ٹھیک کرلوں گا۔"

"مجھے لگا کہ وہ شادی نہیں کرنا چاہتی!" فیاض نے جلدی سے کہا۔ اُسے ایک دم محسوس ہوا کہ وہ نہیں چاہتا کہ رفیق کی عظمت کے ساتھ شادی ہو۔

"محسوس تو مجھے بھی ایسے ہی ہوتا ہے لیکن شادی تو میں کروں گا ہی۔ اگر اُس نے انتظار کیا ہے تو میں بھی اُس کے لیے تڑپ رہا ہوں۔ تم میرے گواہ ہو اور میں نے اُسے بتایا ہے کہ فیاض کے علاوہ میرے دکھ کو اور کوئی نہیں سمجھ سکتا۔" فیاض کو پھر اپنے کان جلتے ہوئے محسوس ہوئے۔ اُسے کسی حد تک گھبراہٹ بھی ہوئی کہ عظمت جانتی تھی کہ وہ اُن دونوں کے تعلق کے بارے میں جانتا تھا۔ اِس گھبراہٹ کے ساتھ اُسے کہیں گہرائی میں ایک طرح کا اطمینان بھی ہوا۔ وہ سمجھ گیا کہ عظمت نے چائے پینے کی دعوت اُسے دیکھتے ہوئے کیوں دی تھی؟

"شادی کرو گے؟" فیاض نے بددلی سے پوچھا۔

"ہاں۔ تم کیا کہتے ہو؟" فیاض نے رفیق کی طرف دیکھا۔ اُسے رفیق کے چہرے پر سوائے سنجیدگی کے اور کوئی تاثر نظر نہیں آیا۔ وہ خوف زدہ ہو گیا۔ وہ چاہتا تھا کہ رفیق شادی نا کرے۔ وہ ایسا کیوں چاہتا تھا؟ اُسے اِس سوال کا جواب نہیں ملا۔ وہ یقیناً رفیق کو خوش دیکھنا چاہتا تھا اور اُسے عظمت کے ساتھ ہمدردی تھی لیکن اُسے محسوس ہوا کہ بیویاں خاوندوں سے خوش نہیں ہوتیں۔ بھائی فقیر حسین کی بیوی بھی اُسے خوش نظر نہیں آتی تھی۔ رفیق کی ماں جب کبھی اُن کے گھر آتی تو وہ ہمیشہ اپنے خاوند کی بدخوئی کرتی اور دوسری عورتوں کی بھی ایسی ہی باتیں بتاتی۔ وہ جب اپنی ماں سے وجہ پوچھتا تو وہ یہی کہتی کہ گھر گھر پھرنے والیوں نے ہر جگہ عورتوں کو ایسی ہی باتیں بتانا ہوتی ہیں۔ اب اُسے اچانک اپنی سوچ درست لگی۔ عظمت بھی شادی کروانے کے بعد ناخوش ہو جائے گی۔ اُسے اچانک عظمت پر ترس آیا۔ وہ پہلے ہی بہت ناخوش رہی تھی۔

"تم مجھ سے بہتر سمجھتے ہو۔" اچانک اُسے فرار کی ایک کھڑکی نظر آئی۔ "عظمت نے ہی

فیصلہ کرنا ہے۔"

"میں اُسے منالوں گا۔" فیاض کو دل کی دھڑکن بند ہونے کے بعد تیز ہوتے محسوس ہوئی۔ اُس نے جواب دینا مناسب نہیں سمجھا۔

ایک دِن ویگن خراب ہوگئی۔ اُس کے ڈیزل پمپ کا مسئلہ تھا۔ ویگن ڈیزل لیبارٹری میں کھڑی تھی اور رفیق مستری کے ساتھ مصروف تھا۔ اُس نے فیاض کو کہا کہ عظمت کے گھر سے دونوں کے لیے کچھ اچھا سا پکوا کے لائے۔ اُسے بھوک لگی ہے اور وہ بازار سے کچھ کھانا نہیں چاہتا۔ فیاض کو اپنے چہرے پر خوشی پھیلتی ہوئی محسوس ہوئی۔ رفیق نے اُس کا چہرہ نہیں دیکھا، وہ انجن پر جھکا ہوا تھا۔ فیاض اپنے تیزی کے ساتھ اُٹھتے ہوئے قدموں کو قابو میں رکھے ہوئے تھا۔ وہ بار بار سوچتا کہ اُسے جلدی کیوں تھی؟ وہ کھلی گلی میں داخل ہو کے کچھ جھجکا، رکا، سوچا کہ واپس چلا جائے اور رفیق کو بتادے کہ کسی نے دروازہ نہیں کھولا لیکن رکا نہیں اور اُس نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ اُسے قدموں کی آواز سنائی دی۔ یہ وہی آواز تھی جو اُس دِن بھی آئی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ دروازہ کھولنے کے لیے آتے ہوئے قدم کسی اور کے ہوں تاکہ عظمت سے اُس کا سامنا نا ہو۔ وہ انہی خیالوں میں تھا کہ دروازہ کھلا اور اُس کے سامنے عظمت کھڑی تھی۔ اُسے دیکھ کے وہ مسکرائی اور اُس نے اُس کے کندھے کے اوپر سے پیچھے دور تک دیکھا۔

"اکیلے آئے ہو؟" اُس کی آواز میں پھولی ہوئی سانس کا بھاری پن تھا۔

"ہاں!" فیاض نے پریشانی سے جواب دیا۔ اُسے اچانک افسوس ہوا کہ وہ کیوں آیا ہے؟

"رفیق ویگن مرمت کروا رہا ہے۔ اُس نے کھانے کے لیے بھیجا ہے۔" وہ جلدی سے اپنا پیغام دے گیا۔

"وہ خود اچھا مستری ہے۔ خود مرمت نہیں کر رہا؟" عظمت نے اُسے ایک نظر دیکھا۔

"ڈیزل لیبارٹری پر ہے۔"

عظمت اُسے بیٹھک میں لے گئی۔ وہ دونوں عجیب سے گھامڑ پن کے ساتھ کرسیوں کے سامنے کھڑے تھے جیسے بیٹھنے کا فیصلہ کر رہے ہوں۔ "میں کھانا بنانے کا کہہ کے آئی۔ میری ماں بنا لے گی اور میں یہاں تمھارے پاس بیٹھوں گی۔" فیاض کو تھوک اپنے گلے میں اٹکتا محسوس ہوا جسے نگلنے میں اُسے کچھ وقت لگا اور تب تک عظمت جا چکی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد جب وہ آئی تو فیاض

کھڑا ہی تھا۔ ''کھڑے پنڈ سے آئے ہو؟'' اُس نے ہنستے ہوئے پوچھا۔ فیاض گھبرا کے ایک دم بیٹھ گیا اور وہ اُسے بیٹھتے دیکھ کر مسکرائی۔ دونوں خاموش بیٹھے رہے۔ فیاض باتیں کرنا چاہتا تھا لیکن وہ کیا بات کرتا؟ اپنی؟ اپنی کیا بات کرتا۔ کوئی ایسی بات تھی ہی نہیں۔ رفیق کی؟ وہ اُسے مناسب نہیں لگا۔ عظمت کی؟ عظمت کی کیا بات کرے؟ رفیق سب بتا چکا تھا۔ ''مالک کیسے ہیں؟'' اُس نے ایک دم پوچھا۔ عظمت نے پوری آنکھیں کھول کے اُس کی طرف دیکھا۔ فیاض کو لگا کہ وہ اپنی کھلی آنکھوں میں اُسے بند کر سکتی ہے۔ وہ تھوڑا سا مسکرائی۔ اُس کی مسکراہٹ میں اُداسی تھی۔ فیاض کو اُن پوری کھلی آنکھوں میں آنسو نظر آئے۔ اُسے افسوس ہوا کہ اُس نے مالک کا کیوں پوچھا؟ اُس کی ماں کا پوچھ لیتا یا پوچھنا ضروری تھا؟

''وہ تین دن ہوئے ......'' عظمت خاموش ہو گئی۔ فیاض سمجھ گیا اور اُس کا سر جھک گیا۔ اُسے عظمت کے رونے کی آواز آ رہی تھی۔ اُس نے عظمت کی طرف دیکھا۔ اُس کی آنکھیں سرخ تھیں اور وہ کچھ کہنا چاہ رہی تھی۔ فیاض اُسے دیکھتا رہا اور وہ آنسو بہاتی رہی۔ وہ اپنی کرسی سے اُٹھا اور عظمت کی کرسی کے بازو پر بیٹھ گیا۔ عظمت نے اُس کی بغل کے ساتھ اپنا سر لگا کے لمبی سانس لی۔ فیاض کو عظمت کے بدن سے صابن، تیل اور جسم کی اپنی خوشبو آئی۔ اِس خوشبو کو سونگھتے ہی اُس نے اپنا بازو عظمت کے کندھے پر رکھا اور اُس کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے اور عظمت نے اُسے رونے دیا۔

......فردوس کا باپ گاؤں کا واحد مالک تھا۔ وہ جب زندہ تھا تو اردگرد لوگ اُس کی موجودگی سے خائف تھے اور مرنے کے بعد بھی اُس کی دہشت تھی کہ وہ کسی وقت بھی آن موجود ہو گا چناں چہ وہ مرنے کے بعد بھی زندہ تھا۔ نذر محمد اُس کا منشی تھا اور اُس کے باپ نے بھی فیروز خاں کی منشی گیری کی تھی۔ فردوس اپنے والدین کی واحد اولاد تھی۔ اُس کے باپ کی صرف ایک بہن تھی جو عمر میں اُس سے اتنی چھوٹی تھی کہ اُس کی بیٹی بھی ہو سکتی تھی۔ زمین کی شرعی تقسیم کے مطابق کچھ جائداد کے کھاتے میں سے نکل جانے کے خوف سے اُس نے اپنی بہن کی شادی نہیں کی تھی۔ گو اُسے گھر میں ہر آرام اور سہولت میسر تھی، گھر کے تمام مالی اور سیاسی معاملات پر اُسے حرفِ آخر سمجھا جاتا تھا لیکن اُس نے ایسی زندگی گزاری تھی جس کا آغاز اور انجام گھر کی چار دیواری کے اندر ہی تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اُس کی بھتیجی بھی اُس کی طرح محرومی کی زندگی گزارے۔ اُسے سردیوں کی طویل راتوں میں بے بسی اور محرومی کا احساس ہوتا کہ کسی کو اُس کے بدن کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کے چکنا چور کر دینا چاہیے، اُسے ایسے سبز باغ دکھانے چاہئیں جن کے متعلق سوچتی وہ سو جائے اور یا پھر اُسے مرزے کی طرح بکی پر بٹھا کے بھگا لے جائے اور چودھری فیروز خاں اپنے تیلیا کمیت گھوڑے پر اُنھیں پکڑ نا سکے۔ وہ خوش تھی، اتنی مطمئن کے اُس کے باپ اور بھائی کا گھر اُس کے اشارے پر چلتا تھا لیکن اُس کی ذات کی کسی گہرائی میں ایک کمی تھی جسے ایک مرد ہی اپنی خواہشیں اُس کے اندر اُنڈیل کے پوری کر سکتا تھا۔ اپنے بھائی کے اطوار سے وہ سمجھ رہی تھی کہ اُس کا فردوس کے ساتھ بھی ایسا ہی کرنے کا ارادہ تھا چناں چہ اُس نے اپنے بھائی کو تعلیم کی اہمیت کے بارے میں وقتاً فوقتاً بتانا شروع کر دیا تا کہ وہ فردوس کو اعلیٰ تعلیم دلوائے اور اگر اُس کا بھائی اُس کی شادی نہیں بھی کرتا تو وہ خود کسی مرزے کے ساتھ بکی پر کسی نئی منزل کی طرف نکل جائے۔ اُس کے اِس ارادے میں منشی نذر محمد رکاوٹ تھی۔ وہ ایک درمیانے قد کا درمیانی جسامت کا آدمی تھا جس کے پاس زمینوں کی آمدن، اخراجات اور واجبات نا صرف درج تھے، وہ اُنھیں انگلیوں پر بھی گنا سکتا

تھا۔ اُسے فردوس کا شہر میں کسی اعلیٰ ادارے میں تعلیم حاصل کرنا ایک خطرہ محسوس ہوتا تھا۔ وہ فیروزہ سے ہی تنگ تھا جو ان پڑھ ہونے کے باوجود معاملات کے بارے میں اتنی باخبر تھی جتنی اُس کی کتابیں اور کھاتے اور اُسے یہ دھڑکا تھا کہ اگر فردوس پڑھ گئی تو ممکن ہے کہ وہ مالی معاملات سنبھال لے اور اُس کا خاندان شاید غربت کی لکیر تک آ جائے۔ یہ ایک سرد جنگ کا آغاز تھا جس کے بارے میں فردوس لاعلم تھی۔ نذر محمد گھما پھرا کے عورتوں کی تعلیم اور تعلیم سے وابستہ بے حیائی کے قصے سناتا کہ کس طرح پڑھی ہوئی جوان لڑکیاں خاندان کی عزت کی پروا نہیں کرتیں۔ وہ فیروزہ کی مثال دیتا کہ غیر تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود وہ ہر معاملے کی تہہ تک پہنچ جاتی تھی اور گھر میں فیروزہ، فیروز خاں کو سمجھاتی کہ اُن کے وقت میں تعلیم کی اتنی اہمیت نہیں تھی جتنا کہ اُس وقت کا تقاضا تھا۔ فردوس کو اگر کوئی اچھا رشتہ نہیں بھی ملتا تو وہ اِس قابل ہوگی کہ زمینوں کا بندوبست کرلے اور اُسے اُن کی طرح کسی منشی کی ضرورت نا ہو اور کسی بھی افسر سے ملنے کے لیے پہلے سفارش نا ڈھونڈنی پڑے۔ فیروز خاں ان پڑھ ہونے کے باوجود جاہل نہیں تھا اور اُسے اپنی بہن کی باتوں میں خلوص اور منطق نظر آتے۔ اپنے خاندان کے لیے کی گئی خدمات کے لیے وہ منشی نذر محمد کے خاندان کو قدر کی نگاہ سے دیکھتا تھا لیکن اُسے اُن کے عزائم کی بھی خبر تھی اور وہ اُن کے مشوروں کے درمیان میں اپنے شک کی باڑ ضرور رکھتا۔

میٹرک کروانے کے بعد اُس نے فردوس کو شہر میں ہوسٹل میں رکھنے کا فیصلہ کرلیا۔ فردوس کے لیے ہاسٹل شروع میں ایک بندی خانہ تھا جہاں اُسے ملازماؤں کی کمی محسوس ہوتی۔ وہ تو صرف مانگ کرنے کی عادی تھی جو اُسی وقت پوری ہو جاتی؛ وہاں ایسا کچھ نہیں تھا۔ سب کچھ کرنے کی اُس کی اپنی ذمے داری تھی جو اُس کے لیے ایک بوجھ تھا۔ وہ واپس جانے کا سوچتی اور پھر گاؤں کا بڑا بندی خانہ اپنی تمام تر ہیبت کے ساتھ اُس کے سامنے کھڑا ہو جاتا جہاں اُس کا باپ اور پھوپھی فیروزہ کالی سیاہ راتوں کو پکارتے: ''کون ہے؟'' اور اُن سیاہ کالی راتوں میں دِل ڈر جاتا تھا۔ پھر وہ کالی سیاہ راتیں سونی ہو جاتیں اور وہ خوف زدہ ہو جاتی اور ہوسٹل اُسے ایک ایسا سیارہ محسوس ہوتا جہاں ٹوٹتے تاروں کی جلتی لاشیں نظر نہیں آتی تھیں۔ اُس نے ہوسٹل کی آزاد زندگی کے ساتھ سمجھوتہ کر کے وہیں رہنے کا فیصلہ کرلیا۔

تب ہی اُس کی ملاقات ایک مرزے کے ساتھ ہوئی جس کے پاس بگی نہیں تھی اور نا ہی

وہ تیر انداز تھا، وہ تو ایک دبلا، دراز قد، گھنے بالوں، کھلی پیشانی اور کالی بے چین آنکھوں والا ایک لاتعلق سا نوجوان تھا جس نے کبوتریوں کے غول میں ایک جوسری کو دیکھا ہی نہیں تھا لیکن وہ جوسری اُسے دیکھ کے اپنے شہہ پروں کے کونے ہلانے لگ گئی تھی۔ کالج اور ہوسٹل کے درمیان میں ایک سڑک تھی جسے پار کرنے کے لیے نیچے سے راستہ بنایا گیا تھا اور اوپر لوہے کا ایک پُل تھا اور سڑک پار کرنے کے لیے زیبرا کراسنگ تھی۔ اِس سڑک کو تین مختلف راستوں سے ضلع کے امرا، روسا، شرفا اور وزرا کی بیٹیاں، بہنیں، بھتیجیاں، بھانجیاں، سالیاں اور دور نزدیک کی رشتہ دار پار کرتیں۔ فردوس اپنے غول کے ساتھ زیبرا کراسنگ پر چلتے ہوئے سڑک پار کرتی۔ اُسے ہر روز وہاں اپنا مرزا نظر آتا۔ وہ اُس کے لیے رکنا چاہتی تھی لیکن اگر وہ لاتعلق سا نوجواں اُسے نظر انداز کر رہا تھا تو وہ بھی چودھری فیروز خاں کی بیٹی تھی اور اپنی ضد کو سلامت رکھنے کے لیے جان کی بازی بھی لگا سکتی تھی اور اُس لاتعلق مرزے کو یہی باور کرانے کا اُس کا ارادہ تھا۔ وہ اپنے غول کے درمیان میں کہیں چلتے ہوئے اُس کے پاس سے گزرتی اور وہ اُسے نظر انداز کرتے ہوئے اپنے سامنے دیکھتا رہتا۔ فردوس کو کبھی لگتا کہ مرزے نے صاحباں کو دیکھا ہی نہیں اور وہ شاید عقل کے ساتھ نظر کا بھی اندھا ہو۔ فردوس جانتی تھی کہ اُس کے باپ نے کئی دشمنیاں ہنڈائی تھیں اور وہ اکثر کہا کرتا تھا کہ مخالف پر وار کرنے کے لیے کبھی پہلا وار نا کرو اور اُسے پہل کرنے دو۔ تمھیں پتا ہونا چاہیے کہ وہ کیا وار کرے گا اور جیسے ہی وہ وار کرنے لگے اُسی وقت اُس کو نیست و نابود کر دو۔ اُس نوجوان کے لاتعلق رویے نے فردوس کے اندر نفرت کا بھانبھڑ روشن کر دیا۔ وہ ہر روز اُسے وہاں کھڑے دیکھتی لیکن اُس نے کبھی فردوس کی طرف نظر اُٹھا کے بھی نہیں دیکھا تھا۔ فردوس نے اب غول کے آگے چلنا شروع کر دیا۔ اب وہ اپنے غول کی سربراہ تھی جو ہواؤں کو چیرتے ہوئے اپنے پیچھے آنے والوں کو ایک مختصر خلا مہیا کرتی تھی جس میں سے وہ سب گزرتے جاتے تھے۔ فردوس نے شوخ، بھڑکیلے اور نظر کو اپنی طرف کھینچنے والے رنگ بھی پہنے لیکن اُس پر کچھ اثر نہیں ہوا جس کے نتیجے میں اُس کے اندر نفرت شدت اختیار کر گئی۔ اب وہ اُسے حاصل کرنا چاہتی تھی، وہ جو بھی ہو۔ ایک صبح ہلکی ہلکی بوندا بادی ہو رہی تھی اور اُس کی ساتھیوں نے سڑک کے نیچے سے جانے کا فیصلہ کیا تا کہ وہ گیلے ہونے سے پہلے ہی اپنی اپنی جگہوں پر پہنچ جائیں۔ فردوس نے اپنی چھتری سنبھالی اور اُس کی ساتھیوں میں بوڑھی میم کا شور اُٹھا لیکن اُسے کسی کی پروا نہیں تھی، وہ تو اپنے سے

لاتعلق شخص کو شکست دینا چاہتی تھی۔ وہ بارش کی ہلکی ہلکی بوندیوں سے بچنے کے لیے سر پر چھتری کا سایہ کیے اکیلی ہی نکل کھڑی ہوئی۔ جب وہ سڑک پر پہنچی تو وہ اُسے نظر نہیں آیا اور اُس کے نا ہونے سے اُسے مایوسی ہوئی اور خوشی بھی کہ وہ اپنی نفرت کو قائم رکھ سکتی تھی اور اُسی وقت اُسے وہ نظر آیا۔ وہ سڑک کے کنارے ایک گھنے درخت کے نیچے کھڑا تھا۔ اُس کے سر کے گھنے بال کھوپڑی کے ساتھ جُڑے ہوئے تھے اور لگتا تھا کہ اُنھیں پلستر کر کے کھوپڑی کے ساتھ جوڑا گیا تھا۔ فردوس کو اُسے دیکھ کے خوشی ہونے کے ساتھ مایوسی بھی ہوئی۔ اب اُس کے پاس کوئی بہانہ نہیں تھا۔ سڑک کو پار کرتے ہوئے اُس نے ہاتھ کے اشارے سے اُسے اپنی طرف متوجہ کیا۔ اُس لاتعلق سے نوجوان کو پہلے تو یقین نہیں آیا۔ اپنی بے یقینی کو غلط یا صحیح ثابت کرنے کے لیے اُس نے چاروں طرف دیکھا کہ اُس اشارے کو وصول کرنے کے لیے کوئی اور نا ہو؛ تب اُسے یقین ہوا کہ اُسے ہی متوجہ کیا جا رہا تھا۔ وہ انجان بن کے دوسرے اشارے کے انتظار میں کھڑا رہا۔ اشارہ کرنے والی کو اُس نے پہلی مرتبہ دیکھا تھا، وہ اُسے کچھ پسند آئی اور ناپسند بھی۔ شکل کی وہ اچھی تھی۔ بادل چھائے ہوئے تھے۔ اتنے گہرے بادلوں نے ایک عرصے کے بعد شہر کے آسمان کو ڈھانپا تھا اور ہلکی ہلکی بوندیاں فضا میں خوش گواری پیدا کر رہی تھیں۔ اشارہ کرنے والی نے سرمئی رنگ کی شلوار قمیص پہن رکھی تھی جو موسم کی مطابقت سے اُسے اچھی لگی۔ تبھی ایک اور اشارہ ہوا۔ لڑکی سڑک کے درمیان میں کھڑی اُسے اشارے کر رہی تھی۔ وہ ایک دم گھبرا گیا۔ سڑک پر ختم نا ہونے والا ٹریفک کا اژدہا تھا اور اُسے چھتری والی کی جان کی فکر لاحق ہوگئی۔ اُس نے دیکھا کہ لڑکی چھتری کے نیچے کھڑی مسلسل اُس کی طرف دیکھے جا رہی تھی۔ نوجوان کو محسوس ہوا کہ لڑکی کو یقین تھا کہ وہ آئے گا اور اُس نے بھی لڑکی کو اُس بھیڑ میں سے نکالنے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ تیزی سے چلتا ہوا اُس کے قریب پہنچا۔ اُسے یاد آیا کہ اُس نے لڑکی کو کبھی کبھار اپنی ساتھیوں کے ساتھ سڑک کو پار کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ ہمیشہ سوچا کرتا تھا کہ لڑکیوں کا ایک مخصوص ٹولہ دوسرے محفوظ راستے اختیار کرنے کے بجائے سڑک کے غیر محفوظ پن کو کیوں محفوظ سمجھتا تھا؟ وہ فنونِ لطیفہ کا طالبِ علم تھا اور وہ جانتا تھا کہ اُن فنون کا تمام تر دار و مدار ایک اتفاق تھا اور دار و مدار والا اتفاق ہی زندگی تھا۔ وہ کالج جانے کے لیے سڑک اس لیے پار کرتی تھی کہ اُس کی ایک دِن کسی نا کسی سبب سے اُس کے ساتھ ملاقات ہونی تھی۔ وہ اب لڑکی سے ایک بازو کی دوری پر تھا کہ ایک تیز رفتار چھکڑا لڑکی کی طرف بڑھ رہا تھا۔

اُسے یقین تھا کہ چھکڑا لڑکی کو کچل دے گا۔ اُس نے تیزی کے ساتھ آگے بڑھ کے لڑکی کو بازو سے پکڑ کے اپنی طرف کھینچا۔ نوجوان جس وقت لڑکی کو چھکڑے تلے روندے جانے سے بچانے کے لیے اپنی طرف کھینچ رہا تھا تو اُسے یہ برِصغیر کے کسی بھی فلم کا سین لگا، لڑکی تو بچ گئی لیکن وہ ہنسے جا رہا تھا اور پاس سے گزرتے ہوئے لوگ اُسے حیرت سے دیکھتے جا رہے تھے۔ لڑکی کو اُس کا ہنسنا ایک پاگل پن لگا۔ لڑکی اِس تمام عرصے میں چھتری سے اپنے سر پر سایہ کیے ہوئے تھی اور اردگرد بارش اب بوندیوں کے بجائے موسلا دھار ہو گئی تھی۔

''خیریت ہی رہی۔ میرا نام مشہد ہے۔ مشہد علی۔'' مشہد نے اب ہنسنا بند کر دیا تھا۔ فردوس کو اُس کی آواز کے بھاری پن میں ایک طرح کی مٹھاس محسوس ہوئی۔ اردگرد بسوں، اکا دُکا کاروں، موٹر سائیکلوں اور چھکڑوں کے انجنوں اور ہارنوں کی آوازوں کے ساتھ تانگوں اور ریڑھوں کے گھوڑوں اور خچروں کے ٹاپوں کی آواز بھی شامل تھی۔ اِس سارے کے باوجود فردوس کو مشہد کے قہقہے کی گونج اور آواز کا ترنم اپنے اندر جذب ہوتے محسوس ہوا۔ اُس نے اپنے چہرے سے گھبراہٹ کو دور کرتے ہوئے ایک جھٹکے کے ساتھ بازو چھڑایا اور کالج کی طرف چل پڑی۔

اُس دِن کے بعد فردوس نے سڑک پار کرنا ترک کر دیا۔ وہ کالج کے گیٹ میں بنی چھوٹی کھڑکی میں سے اُسے حسبِ معمول سامنے کی طرف دیکھتے دیکھتی ضرور اور پھر زیرِ زمین راستے سے کالج چلی جاتی۔ اُس چھوٹے سے واقعے نے اُس کی زندگی میں اُلجھنوں کے گرداب بنا دیے تھے۔ ہاسٹل کا چھوٹا سا کمرہ جو اُسے اپنی قبر لگا کرتا تھا اب ایک محل سرا میں تبدیل ہو گیا تھا۔ وہ جاگتے میں اُس میں ٹہلتی رہتی یا اُس کی صفائی اور سجاوٹ میں لگی رہتی۔ پہلے وہ اُتارے ہوئے لباس ویسے ہی پھینکتی جاتی تھی اور دو ہفتے بعد جب گاؤں جاتی تو اُنھیں دھلوا اور استری کروا لاتی تھی۔ اب وہ جس بھی لباس کو اُتارتی، اُسی وقت آیا کے ہاتھ دھوبی کو بھیج دیتی اور دھلائی کے بعد الماری میں احتیاط سے رکھ دیتی۔ پھر وہ رات کے کسی وقت اُٹھ کے کمرے میں ٹہلنا شروع کر دیتی اور پھر الماریوں میں رکھے لباسوں کی ترتیب تبدیل کرتی رہتی۔ وہ سڑک پار کرنے سے خائف تھی۔ اُسے مشہد سے خوف تھا کہ وہ سڑک کے عین درمیان میں اُس کے سامنے آن کھڑا ہو گا۔ وہ ابھی تک اُس کا سامنا کرنے کے لیے اپنے آپ کو تیار نہیں کر سکی تھی۔ وہ اُس سے خوف زدہ کیوں تھی؟ اُس نے سوچا۔ وہ جو فیروز خاں کی بیٹی تھی، جو گاؤں کا بلا شرکتِ غیرے

مالک تھا اور جس کی علاقے میں ایک دھاک تھی اور وہ جس کے خون میں خوف کا ایک قطرہ بھی نہیں تھا، وہ ایک ایسے آدمی سے خوف زدہ تھی جسے وہ جانتی تک نہیں تھی۔ پھر اُسے خیال آیا کہ وہ غیر اہم آدمی اتنا اہم کیوں ہے کہ وہ اُسے چھپ کے دیکھتی ہے، ملنا بھی چاہتی ہے لیکن بس چھپ کے ہی دیکھنا چاہتی ہے اور ملنا بھی نہیں چاہتی۔ وہ اتنی بے بس کیوں تھی؟ وہ بے بس اِس لیے تھی کہ مشہد کو ایک مشکل وقت میں اپنے اعصاب پر مکمل اختیار تھا جب کہ اُس کے حواس بس میں نہیں تھے۔ اُس ایک اہم لمحے میں وہ اُس پر حاوی ہو گیا تھا۔ وہ جس پر پھوپھو بھی حاوی نہیں ہو سکیں تھیں، وہ پھوپھو جو اباجان پر بھی حاوی تھیں یا ایسے ہی محسوس ہوتا تھا، اُس نے مشہد کو صرف ایک واقعہ سے خود پر حاوی کر لیا تھا۔ اُسے مشہد پر اب یہ ثابت کرنا ہوگا کہ اُس پر کوئی حاوی نہیں ہو سکتا۔ اِس خیال نے فردوس کو تقویت دی۔ اُس نے سڑک پار کر کے کالج جانے کا فیصلہ کر لیا اور کسی کو اپنے فیصلے سے آگاہ نہیں کیا۔ وہ جب گیٹ سے نکلی تو اُس نے سامنے نظر دوڑائی اور پھر ایک اور نظر سے ہر طرف دیکھا۔ مشہد وہاں نہیں تھا۔ اُسے اپنی نظر پر یقین نہیں آیا۔ اُس نے سڑک پار کر کے وہاں کھڑے لوگوں سے مشہد کے بارے میں پوچھا، اُس کا حلیہ بتایا لیکن کوئی بھی مشہد کو یاد نہیں کر سکا۔ یہ سُن کے فردوس کو کچھ تسلی بھی ہوئی کہ وہ اتنا اہم بھی نہیں تھا کہ کوئی اُسے یاد رکھتا۔ وہ کافی دیر گزرنے والوں سے پوچھتی رہی اور پھر ایک آدمی اُسے کچھ اطلاع دینے میں کامیاب ہوا۔ اُس نے بتایا کہ وہ مشہد کو جانتا ہے۔ مشہد ایسے ہی اُن جگہوں پر کھڑا رہتا ہے جہاں بھیڑ ہو۔ وہ جگہیں بدلتا رہتا تھا اور وہ مشہد کو ڈھونڈ کے فردوس کا پیغام پہنچا دے گا۔ یہ سن کے فردوس کی ڈھارس بندھی اور وہ کالج چلی گئی۔ وہ اب ہر روز سڑک پار کرتی۔ فردوس کو اُس آدمی کی بات کا یقین تھا۔ وہ سوچتی کہ اُسے ایک اُمید نے یقین کے ساتھ باندھ دیا تھا یا یقین نے سامنے ایک اُمید رکھ دی تھی۔ وہ روز سڑک پار کرتی اور ہر روز وہ وہاں نا ہوتا۔ اُسے اُمید تھی کہ وہ آئے گا۔ وہ آدمی فردوس کو چند بار نظر آیا تھا اور اُس آدمی نے ہر بار مسکراتے ہوئے سلام کیا تھا جو فردوس کو ایک پیغام لگا۔ وہ اُسی پیغام سے مطمئن تھی۔ محل سرا کا وہ کھلا کمرہ ایک قبر میں تبدیل ہو گیا۔ اب اُس کمرے میں اُس کا دم گھٹنے لگا۔ ہر طرف میلے کپڑے بکھرے ہوئے تھے اور وہ اُس گھٹن میں مطمئن!

پھر ایک دن وہ اپنی مخصوص جگہ پر مخصوص انداز میں کھڑا تھا!

مشہد کو دیکھتے ہی فردوس کو اپنے دل کی دھڑکن تیز ہو کے بند ہوتی محسوس ہوئی۔ اُسے

سانس رکتے ہوئے لگا۔ اُسے احساس ہوا کہ اُس کا چہرہ سُرخ ہو گیا ہے، اُس کے کان جل رہے تھے اور پھر ایک دم وہ پسینے میں نہا گئی۔ اُسے اپنی بغلوں اور کمر سے پسینہ بہتا ہوا محسوس ہوا۔ اُس نے سوچا کہ فیروز خاں کی بیٹی اور اتنی بزدلی کا مظاہرہ! اُسے اچانک اپنے اندر ایک انوکھی شکتی کا دخول محسوس ہوا۔ وہ اعتماد سے چلتے ہوئے مشہد کے پاس جا کھڑی ہوئی۔ مشہد اُس کی موجودگی سے بے نیاز سامنے ہی دیکھے جا رہا تھا۔ پھر اُسے فردوس کے اپنے پاس کھڑے ہونے کا احساس ہوا۔ وہ فردوس کی طرف دیکھ کے اپنایت سے مسکرایا۔

''میرا نام فردوس ہے۔'' فردوس اپنی جھجک پر قابو پا چکی تھی۔ وہ بھی مشہد کی طرف دیکھ کے اپنایت سے مسکرائی۔

''مجھے تمھارا پیغام ملا تھا۔ بہت ہمت کی تم نے۔ میں شاید چند مہینے اور نا آتا یہاں۔ بہت باہمت ہو تم۔ ایسے اجنبی کو ڈھونڈ نکالا جو میرا شناسا سا تھا۔'' فردوس کو لگا کہ وہ مشہد کی آواز کے ساتھ بہے جا رہی ہے۔ اُس نے سوچا کہ وہ کاغذ کی ناؤ نہیں جو پانی کے بہاؤ کے آگے بے بس ہوتی ہے۔ اُس نے خود کو اُس بہاؤ سے الگ کیا۔

''کل آؤ گے؟'' فردوس نے اعتماد سے پوچھا۔ فردوس کی آواز میں اتنا اعتماد تھا کہ مشہد نے چونک کے اُس کی طرف دیکھا۔ جواب میں فردوس مسکرا دی۔ وہ مشہد کو نہیں کہنا چاہتی تھی کہ اُس کا کل اُس کے ساتھ ملنے کا ارادہ تھا۔ اُس کی خواہش تھی کہ مشہد خود تقاضا کرے۔

''ہاں!'' مشہد تھوڑا سا رکا۔ وہ اپنی جھجک ظاہر نہیں ہونے دینا چاہتا تھا۔ فردوس اُس کی جھجک کو پہچان گئی اور اُسے خوشی ہوئی کہ اعصاب پر کھچاؤ ڈالنے والی اِس ملاقات میں مشہد کو پست قدمی کرنا پڑی تھی۔ ''کل میرے ساتھ چائے پیو گی؟ یہاں پاس ایک چائے خانہ ہے جو بورژوا طبقے کے لیے نہیں لیکن وہاں چائے اُن کے چائے خانوں سے بہتر ہوتی ہے۔'' فردوس کو چائے خانے کے معیار سے غرض نہیں رہی تھی۔ اُسے اطمینان ہوا کہ مشہد اُسے بورژوا طبقے کا نمائندہ سمجھتا ہے جو وہ تھی بھی۔ مشہد کے لیے یہ فیصلہ کرنا قطعاً مشکل نہیں ہوا ہوگا کیوں کہ وہ جس کالج میں زیرِ تعلیم تھی وہاں بورژوا ہی تعلیم حاصل کرتے تھے۔ پھر مشہد میں اتنا اعتماد تھا کہ وہ فردوس کو ایسے چائے خانے میں لے کے جانا چاہتا تھا جو اُس کے معیار کا نہیں تھا۔

''پیوں گی۔'' وہ خوش دلی سے ہنسی، ''دعوت کو کبھی ٹھکرایا نہیں جانا چاہیے خواہ وہ دشمن کی

کیوں نا ہو۔'' اُسے اپنے باپ کی بار بار کہے جانے والی بات یاد آ گئی۔

''کل یہیں پر ہوں گا۔ پھر وہاں چلیں گے۔'' اُس نے ہاتھ سے اپنے دائیں طرف اشارہ کیا اور جواب کا انتظار کیے بغیر چلا گیا۔ فردوس اُس کے اچانک چلے جانے کے بارے میں دیر تک سوچتی رہی۔ وہ اِس فیصلے پر پہنچی کہ مشہد کو خدشہ تھا کہ وہ کہیں آخری وقت پر انکار نا کر دے۔ ساری شام فردوس فیصلہ نا کر سکی کہ وہ کل کون سے رنگ کا لباس پہنے؟ وہ آخری انتخاب کرنے میں ناکام ہوگئی تو اُس نے سفید شلوار قمیص نکال لی۔ وہ یہ رنگ بہت کم پہنا کرتی تھی۔ سفید پہن کے اُسے ہمیشہ احساس ہوتا کہ وہ کفن میں لپٹی ہوئی ہے۔ وہ جب مشہد سے ملی تو اُس نے کہا تو کچھ نہیں لیکن اُس کی تعریفی نظر سب کچھ کہہ گئی۔ اُسے مشہد کا اِس طرح دیکھنا اچھا لگا۔ اُس کی پھوپھی کو اُس کے لباس جدید دور کی واہیاتی لگتے اور دوست تو ہمیشہ حسد کی بھٹی میں بھنتی رہتی تھیں۔ وہ مشہد کے ساتھ چلتے ہوئے خوشی سے مسکرائے جا رہی تھی۔ وہ جس چائے خانے میں گئے وہاں دو میزوں کے گرد بینچ تھے اور دو کے گرد کرسیاں۔ وہ کرسیوں والی ایک میز پر بیٹھ گئے۔ میزوں پر اخبار پڑے ہوئے تھے۔ اپنی خستگی اور قدامت کے باوجود چائے خانہ صاف تھا۔ بینچوں پر چند لوگ بیٹھے باتوں میں مشغول تھے۔ کسی نے اُنھیں غور سے نہیں دیکھا۔ فردوس کو محسوس ہوا کہ وہ وہاں بیٹھے ہوئے اُن تمام لوگوں کو جانتی ہے۔ اُن کے چہرے اور انداز اُسے دیکھے ہوئے لگے۔ اُس نے سوچا کہ وہ کسی بھی میز پر بیٹھ کے اُن کے ساتھ بات چیت کر سکتی ہے؟ اُسے خیال آیا کہ وہ اُن کے ساتھ کیا بات چیت کرے گی؟ وہ لوگ اُسے اہم اور معتبر لگے۔ وہ ایک دم اُن سے خوف زدہ ہوگئی اور مشہد سے بھی۔ وہ اُن لوگوں سے خائف تو تھی لیکن چائے خانہ اُسے ایک طاقت دے رہا تھا۔ اُسی وقت ایک بیرا آیا اور اُس نے صاف میز کو جھاڑن کے ساتھ صاف کرتے ہوئے فردوس کو ایک مسکراہٹ دی۔ اُس مسکراہٹ میں اپنایت اور شناسائی تھی۔ فردوس کو لگا کہ بیرا اجنبیوں کو واقف ظاہر کرنے کا ہنر جانتا ہے۔ بیرے نے استفہامیہ انداز سے مشہد کی طرف دیکھا جس نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ دل چسپی کے ساتھ اِس خاموش مکالمے کو سن رہی تھی۔ بیرا چلا گیا اور وہ ایک دوسرے کو دیکھ کے مسکرا دیے۔ اُن کی مسکراہٹوں میں اجنبی پن کی جھجک اور شناسائی کی اپنایت تھی۔ فردوس کو لگا کہ مشہد کچھ کہنا چاہتا ہے اور وہ اُس کی بات کے انتظار میں اُس کی طرف دیکھتی رہی جب کہ مشہد اپنے خیالوں میں گم سامنے دیکھتا رہا۔ فردوس

کو اچانک خیال آیا کہ مشہد ہر وقت سامنے کیا دیکھتا رہتا ہے؟ اب مشہد کے سامنے دیوار تھی اور وہ اُس دیوار کو دیکھے جا رہا تھا۔ دیوار میں فردوس کو ایسی کوئی کشش نظر نہیں آئی جو کسی کو اِس طرح اپنی طرف اتنی شدت سے منہمک کر لے۔ اُسی وقت بیرا چائے لے کے آ گیا۔ اُس نے پیالیاں سامنے رکھتے ہوئے پھر سوالیہ نظر سے مشہد کی طرف دیکھا۔ اِس بار فردوس کو اُس کی نظر میں ایک مختلف سوال نظر آیا اور مشہد نے پھر اثبات میں سر ہلایا۔ یہ اثباتی حرکت اُسے پہلے سے مختلف لگی جیسے بیرے کی نظروں کا خاموش سوال الگ تھا۔ فردوس نے فیصلہ کر لیا کہ آنے والے وقت میں وہ مشہد سے اِن خاموش سوالوں اور جوابات کے متعلق جاننا چاہے گی۔

فردوس نے چھوٹی سی پیالی کو اُٹھا کے چھوٹا سا گھونٹ لیا۔ چائے گرم، خوشبودار اور میٹھی تھی۔ اُسے میٹھی چائے پسند نہیں تھی لیکن اُس چائے کی مٹھاس میں ایسی مٹھاس تھی جس نے چائے کے لطف کو دوبالا کر دیا۔ وہ پیالی میں سے اُٹھتی ہوئی بھاپ کو دیکھتی تھی اور سوچتی تھی کہ وہ مشہد کے ساتھ یہاں کیوں آئی؟ معاشرے کے جس حصے سے اُس کا تعلق تھا وہاں لوگ دو زندگیاں جیتے تھے؛ ایک مردانہ اور دوسری زنانہ۔ اُس کی زندگی کا مردانہ حصے کے ساتھ کوئی تعلق نہیں تھا اور اُسے یہ چائے خانہ مکمل طور مردانہ حصہ لگا اور اجنبیوں کے درمیان میں اُس نے اچانک اپنے آپ کو پانی کے باہر مچھلی کی طرح محسوس کیا۔ اُسے اپنا دم گھٹتے ہوئے محسوس ہوا۔ اُسے لگا کہ اُسے تازہ ہوا کی ضرورت تھی۔ اُس نے چائے کا ایک لمبا گھونٹ لیا۔ چائے اب اُتنی گرم نہیں تھی اور مٹھاس بھی زیادہ لگ رہی تھی۔ اُس نے مشہد کی طرف دیکھا جو ابھی تک سامنے دیکھے جا رہا تھا۔ اُسے مشہد کی خاموشی اور لاتعلقی سے اُلجھن بھی ہوئی۔ اُس نے سوچا کہ ہاسٹل کے سامنے کھڑا اُسی طرح وہ لاتعلقی سے سامنے دیکھتا رہتا تھا اور وہ اپنی ہتک محسوس کرتی تھی کہ وہ اُسے کیوں نہیں دیکھ رہا؟ وہ جانتی تھی کہ لوگوں کی اکثریت وہاں صرف اِس لیے کھڑی ہوتی تھی کہ وہ سڑک پار کرتی لڑکیوں کو دیکھ سکیں۔ اب اُس پر منکشف ہوا کہ مشہد باقی لوگوں سے مختلف تھا۔ اُسے سڑک پار کرتی لڑکیوں یا اپنے سامنے بیٹھی لڑکی سے کوئی غرض نہیں تھی۔ اُسے مشہد کا یہ انداز اچھا بھی لگا کیوں کہ وہ زندگی میں ہر جگہ اہم رہی تھی، کسی نے کبھی اُس کی بات رد نہیں کی تھی اور اب اِس طرح اُسے نظر انداز کیے جانا اچھا لگا۔ اُسے اپنے لیے یہ مقابلے کی دعوت لگی اور اُس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ مشہد کے اندر داخل ہو کے اِس لاتعلقی کی وجہ جانے گی۔

فردوس اور مشہد اب باقاعدگی سے ملنے لگے اور مشہد ہمیشہ اُسے ایسے ہی چائے خانوں میں لے کے جاتا۔ وہ ہاسٹل اور کالج سے غیر حاضر رہنے لگی تھی لیکن وہ جانتی تھی کہ اُسے کوئی منع نہیں کرے گا اور نا ہی جواب طلبی ہوگی۔ وہ تو راتوں کو اپنے کمرے میں ہی ہوتی تھی جب کہ اُس کے علم میں تھا کہ کئی لڑکیاں رات باہر گزار آتی ہیں۔ شروع میں وہ سوچتی کہ مشہد اُسے کسی مہنگی جگہ پر کیوں نہیں لے کے جاتا؟ اور پھر اُسے خیال آیا کہ شاید اُس کے مالی حالات اجازت نا دیتے ہوں، کبھی وہ سوچتی کہ خود خرچ کرلے گی لیکن وہ اب تک جان چکی تھی کہ مشہد انتہا کا انا پرست تھا اور وہ کبھی نہیں چاہے گا کہ فردوس اُس کی جگہ ادائی کرے۔ ایک دِن چائے کے پیسے دینے کے لیے مشہد نے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ وہ عموماً روپے کے چند نوٹ ہی نکالا کرتا تھا لیکن اُس دِن اُس کی جیب سے سو، پانچ سو اور ہزار کے نوٹوں کی گڈی نکلی اور پھر اُس نے کچھ شرمندگی اور کچھ مانوس لاتعلقی کے ساتھ اُنھیں واپس جیب میں ڈال کے دوسری جیب سے روپے کے چند نوٹ نکالے۔ فردوس کو اتنے سارے نوٹ دیکھ کے حیرت کے ساتھ خوشی بھی ہوئی اور ساتھ ہی وہ خوف۔ زدہ بھی ہوگئی کہ مشہد کسی غیر قانونی دھندے میں ملوث نا ہو۔ یہ خیال آتے ہی اُسے ایک طرح سے تسلی بھی ہوئی کہ اُس کا باپ مشہد کو یقیناً پسند کرے گا کیوں کہ اُسے قانون شکن لوگ پسند تھے۔

اگلی ملاقات میں مشہد نے اُسے پوچھا کہ کیا وہ اُس کا گھر دیکھنا چاہے گی؟ فردوس کو یہ سُن کر خوشی ہوئی؛ اتنی خوشی کہ وہ چھپا نا سکی۔ مشہد کی گھر لے کے جانے کی دعوت کا سُن کے اُسے محسوس ہوا کہ اُن کا رشتہ کوئی رُخ اختیار کر رہا ہے۔ فردوس کے چہرے کے تاثرات دیکھ کے ایک لمحے کے لیے مشہد کی آنکھوں میں دھند پھیل کے چھٹ گئی اور پھر وہ بھی مسکرانے لگا۔ جس دِن اُنھوں نے مشہد کے گھر جانا تھا اُس دِن وہ ایک خصوصی اہتمام کے ساتھ سج کے آئی۔ وہ رنگوں میں ملبوس تھی، خوشبوئیں اُس کے سراپے کے گرد رقص کرتی تھیں اور اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹوں کا سیلاب تھا۔ اُس دِن پیدل چلنے کے بجائے وہ ایک کار میں گئے اور کار ایک ایسے علاقے میں داخل ہوئی جس کے متعلق فردوس نے سن رکھا تھا کہ وہاں شہر کے رؤسا رہتے ہیں۔ وہ اُس علاقے میں داخل ہوکے محویت میں کھوگئی۔ اُسے یقین نہیں آرہا تھا کہ ایک عام سا لباس پہننے والا نوجوان جو ایسے چائے خانوں میں بیٹھتا ہے جہاں صرف ایک پیالی پی کے سارا دِن بیٹھے رہنے والے بیٹھتے ہیں، جو پورے شہر کا دو ہفتوں میں چکر مکمل کرتا ہے، جو زندگی کے کسی معاملے میں دل چسپی نہیں

رہتا، حتیٰ کہ بعض اوقات اُسے محسوس ہوتا کہ اُس میں بھی نہیں، وہ اُسے اپنے ایسے گھر میں لے کے جارہا تھا جو اِس علاقے میں واقعہ تھا۔ فردوس کو ایک دم خیال آیا کہ ممکن تھا کہ مشہد کا باپ کسی گھر میں ملازم ہو اور وہ اُس پر دھاک بٹھانے کے لیے اپنا گھر دکھانے کے بہانے یہاں لے آیا ہو جب کہ گھر کے مالک کہیں گئے ہوئے ہوں۔ اُس کے ذہن میں کئی ایسے فلم گھوم گئے جن میں ایسے ہوتا دکھایا گیا تھا۔ اِس سوچ نے اُس کی مرعوبیت کسی حد تک کم کی اور اُسے اپنے ہی بنے ہوئے کھچاؤ سے آزاد کیا۔

گھر کے اندر داخل ہونے کے بعد فردوس نے جو دیکھا اُس کے ہوش گم کر گیا۔ سرسبز وسیع لانوں میں گھری ہوئی دو منزلہ عمارت اُس کے سامنے تھی اور وہ ایک ہیبت میں گم اُسے دیکھتی تھی۔ اگر مشہد کا باپ یہاں ملازم تھا تو پھر بھی وہ کوئی عام آدمی نہیں ہو گا۔ لان نفاست سے سنبھالے ہوئے تھے، اُس کے ناخنوں کی طرح جنھیں وہ گاؤں کی نائین کے بجائے شہر کی ایک بیوٹیشن سے ترواشتی تھی۔ لانوں کو الگ کرنے کے لیے ترتیب سے تراشی گئی خوب صورت باڑیں تھیں، موسمی پھول تھے جہاں رنگ برنگی تتلیاں ایک دوسرے کے تعاقب میں اُڑتی تھیں، سجاوٹی جھاڑیاں تھیں جنھیں ایسی بے ترتیبی سے لگایا گیا تھا کہ ایک ترتیب میں نظر آتیں۔ فردوس کا خیال تھا کہ اُس کے گھر سے وسیع کوئی گھر ہو ہی نہیں سکتا، گاؤں میں ہر طرف اُن کی زمین تھی اور وہ جتنا کھلا چاہتے گھر بنا سکتے تھے لیکن اُس کے باپ نے بتایا کہ گھروں کی وسعت کی ایک حد ہوتی ہے اور اُس کے خیال میں اُن کا گھر وسعت کی اُس حد کے اندر تھا۔ جب اُس نے مشہد کا گھر دیکھا تو اُسے اپنا گاؤں والا گھر ایسے ہی لگا گاؤں میں جیسے اُس کے مقابلے میں گاؤں کے دوسرے گھر تھے۔ گھر کے داخلی دروازے پر ایک دربان نے مسکراتے ہوئے اُنھیں خوش آمدید کہا۔ دربان کے لب و لہجہ میں خوف میں چھپے ایک احترام کو بھی دخل تھا اور پہلی بار فردوس کو احساس ہوا کہ یہ مشہد کا ہی گھر ہے اور اُس نے اُسے ایک ایسے احترام اور اپنایت سے دیکھا جو پہلے اُس کے رویے میں نہیں تھا۔ فردوس کو اپنی سوچ پر فوری طور پر افسوس بھی ہوا۔ وہ ایک کشادہ پیش دالان میں داخل ہوئے جو فردوس کو اتنا کھلا لگا کہ اُس کا آدھا گھر اُس میں سما جاتا۔ دیواروں پر ایسی تصویریں لگی تھیں جو اُس نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھیں اور اُن میں چند برہنہ اور نیم برہنہ عورتوں کی تھیں۔ وہ اُنھیں دیکھ کے شرما بھی گئی لیکن اُس نے ظاہر نہیں ہونے دیا۔ وہ ایک چوڑا زینہ طے کرتے ہوئے

اوپر والی منزل میں گئے تو وہاں کھلی کھڑکیوں میں سے لان اپنی تمام تر فن کارانہ خوب صورتی کے ساتھ دیکھے جا سکتے تھے۔ وہ کچھ دیر اُنھیں دیکھے جانا چاہتی تھی، اُس کے جی میں تھا کہ وہ اُس خوب صورتی کو اپنی بینائی میں قید کر لے لیکن مشہد تب تک ایک گیلری میں داخل ہو چکا تھا اور وہ اُس کے پیچھے ایک کمرے میں داخل ہوئی۔ اُسے اِس طرح کسی اجنبی کے کمرے میں داخل ہونا عجیب ضرور لگا۔ وہ کمرہ اُسے کسی پری کی خواب گاہ ہی لگا۔ اُسے گاؤں میں اپنا کمرہ یاد آ گیا جس میں رنگلے پایوں والا ایک پلنگ بچھا ہوتا ہے اور چند کرسیاں اور کئی خانوں والی ایک الماری جس میں اُس کے لباس، زیر جامے، خوشبوئیں اور ایسا ہی اور بہت کچھ پڑا ہوتا۔ مشہد کا کمرہ ایک چھوٹا سا گھر تھا۔ وہ ایک گرم صبح تھی اور کمرہ اتنا ٹھنڈا تھا کہ اُس کے بدن میں ایک کپکپی سی دوڑ گئی۔ ایک کونے میں فریج رکھا ہوا تھا اور دوسرے کونے میں ڈریسنگ ٹیبل جس پر خوشبوؤں اور کریموں کی قطاریں تھیں۔ فردوس نے سوچا کہ مشہد یہ خوشبوئیں استعمال نہیں کرتا کیوں کہ اُس کے بدن سے پسینے کی ہلکی سی بو آتی رہتی تھی جو اُسے ناپسند ہونے کے بجائے ہمیشہ بے چین کر دیتی تھی۔ اُس نے سوچا کہ اتنی خوشبوئیں صرف مشہد کے لیے ہی تھیں یا کوئی اور بھی اُنھیں استعمال کرتا تھا؟

مشہد مسلسل اُسے دیکھے جا رہا تھا اور اُس کے ہونٹوں پر دل چسپی میں ڈوبی ہوئی مسکراہٹ تھی۔ فردوس کو محسوس ہوا کہ وہ اُس کا تمسخر اُڑا رہا تھا لیکن پھر اُسے مشہد کی آنکھوں کی گہرائی میں ایک اپنایت نظر آئی۔ اُسی وقت دروازہ کھٹکھٹایا گیا اور بند گلے والے آدھے بازو والا جیکٹ اور پتلون پہنے آدمی داخل ہوا جس کے ہاتھ میں ٹرے تھا جس پر پانی اور چائے کی پیالیاں رکھی ہوئی تھیں۔ فردوس اتنی گھبرائی ہوئی تھی کہ اُسے اپنی پیاس کا احساس ہی نہیں ہوا اور وہ ایک ہی سانس میں پانی ختم کر گئی اور پھر اُس نے معذرت خواہانہ سی مسکراہٹ کے ساتھ مشہد کی طرف دیکھا۔ مشہد نے ظاہر کیا کہ وہ اُس کی طرف دیکھ نہیں رہا۔ کمرے میں رکھی وکٹورین کرسیوں پر بیٹھ کے اُنھوں نے چائے پی اور پھر مشہد اُٹھ کھڑا ہوا۔

''میں لیٹنا چاہتا ہوں۔ آؤ! میرے ساتھ لیٹو۔'' وہ دونوں ایک عرصے سے مل رہے تھے اور مشہد کے رویے میں ہمیشہ ایک مٹھاس اور باہمی معاملہ فہمی رہی تھی؛ کسی نے کبھی اپنی رائے دوسرے پر ٹھونسی نہیں تھی۔ فردوس کو مشہد کی شخصیت کا یہی پہلو سب سے زیادہ پسند تھا جس کی ایک وجہ یہ بھی تھی گھر میں اُس کا باپ اور پھوپھو ہمیشہ کوئی نا کوئی حکم صادر کیے ہوتے جب کہ مشہد نے

ہمیشہ جذبات کے بجائے منطق کو ترجیح دی تھی۔ پہلی مرتبہ اُسے مشہد کے لہجے میں برتری اور ایک حکم نظر آیا۔ کیا وہ بھاگ جائے؟ اتنے وسیع گھر میں سے کیا وہ باہر نکلنے میں کامیاب ہو سکے گی؟ پھر اُسے خیال آیا کہ اگر مشہد نے اُس کے ساتھ زیادتی کی کوشش کی تو وہ اپنا دفاع کرنے کے لیے کچھ بھی کر جائے گی اور بعد میں اُس کا باپ بدلہ لینے سے کبھی نہیں جھجکے گا۔ فردوس نے اپنی سوچ میں سے باہر نکل کے کوئی جواب دینے کے بجائے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''یہاں آ جاؤ!'' مشہد نے کھلی مسہری کی خالی جگہ پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ فردوس نے سوچا کہ مسہری اتنی کھلی اور آرام دہ تھی کہ اِس پر سہاگ رات منانا ایک خواب دیکھنا ہی تھا۔ پھر اچانک اُسے خیال آیا کہ کیا وہ اپنے آپ کو تیار کر رہی تھی؟ اُس نے جلدی سے مشہد کی طرف دیکھا۔ وہ اِس بار چھت کو دیکھ رہا تھا اور فردوس کو محسوس ہوا کہ اُسے اُس کے لیٹنے یا نا لیٹنے سے کوئی دل چسپی نہیں تھی۔ اِس خیال سے فردوس کو حوصلہ ہوا۔

وہ دونوں چھت کو دیکھ رہے تھے۔ فردوس کو محسوس ہوا کہ وہ دونوں پنجرے میں بند اُن جانوروں کی طرح تھے جن کی حرکت جگہ کی کمی کی وجہ سے محدود ہو گئی ہو۔ اتنی کھلی مسہری اب اُسے تنگ لگنے لگی۔ تبھی مشہد نے ایک لمبی سانس لی اور اُس کا ہاتھ تھام لیا۔ فردوس کے بدن میں ایک کپکپی دوڑ گئی۔ مشہد کے ہاتھ میں پگھلا دینے والی حدت کے بجائے یخ بستگی تھی۔ اُس نے کمرے میں لگے دو ایر کنڈیشنوں کی طرف دیکھا جو چل رہے تھے۔ اُس نے دوسرے ہاتھ سے اپنے گال چھوئے جو گرم تھے۔ مشہد نے ایک ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ فردوس کو اُس قہقہے میں ایک طرح کی محرومی کا احساس ہوا۔ اُس نے سوچا کہ اتنے عالی شان گھر میں رہنے والا اپنی محرومی کیوں نہیں چھپا سکا؟ کیا وہ بے بس تھا؟ فردوس نے اپنے چہرے کو بے تاثر رکھنے کی کوشش کی۔

''تم نے کرشن چندر کا نام سنا ہے؟ تمھاری خالی آنکھوں سے میں سمجھ گیا ہوں کہ نہیں سنا۔ وہ اُردو کا ایک مشہور فکشن نویس تھا۔ اُس کا ایک افسانہ تھا ''دس روپے کا نوٹ''۔ اُس کا ہیرو بھی ایسے ہی عالی شان قسم کے ایک گھر میں رہتا تھا۔ اُس کے سمیت اُس سے پہلے آنے والے گھر کے سب آدمی نامرد تھے۔ گھر کا سربراہ اپنی بہو کے لیے ایک سانڈ لاتا جو اُسے گابھن کر دیتا اور وہ حرامی خاندان اپنی امارت کو قائم رکھے ترقی کرتا رہتا۔ کچھ ایسا ہی اِس گھر میں ہو رہا ہے۔ میں یہاں ولی عہد ہوں۔ جب میں چھوٹا تھا تو اپنے ہم عمروں کی طرح ایک عام بچہ تھا۔ اُن میں اور مجھ

میں کوئی فرق نہیں تھا۔ اُس کے بعد میری تربیت کا آغاز ہوا جس میں عورت اور جنسی جذبات غیر اہم تھے۔ مجھے کاروبار کے طریقے سکھائے گئے۔ میرے لیے یہ ایک نئی دنیا تھی جس میں مجھے ایک روشن مستقبل دکھائی دیا۔ میں مقصد کے حصول کے لیے اپنے اندر کی ہر خواہش سے دور ہو گیا۔ میں ہر وقت کاروبار اور دولت کے انباروں کے متعلق سوچتا رہتا جو میں نے لگانے تھے۔ اُسی وقت میری شادی کی بات ہونے لگی۔ مجھے شادی میں کوئی دل چسپی نہیں تھی۔ میں نے اپنے باپ کو اپنے ارادے سے آگاہ کیا تو اُس کی خوشی بیان سے باہر تھی۔ اب تک میں ایک کامیاب آدمی بن چکا تھا۔ میں نے شادی اور ایک خوب صورت بیوی کے متعلق سوچا تو میرے اندر کسی قسم خواہش بیدار نا ہوئی۔ میں چاہتا تھا کہ عورت کا خیال مجھے جھنجھوڑ کے کسی خواب سے باہر لے آئے۔ ایسا ہوا نہیں۔ میں نے ایک عورت کے ساتھ شب بسری کا اہتمام کیا لیکن مجھے ناکامی ہوئی۔ میں ایستادگی کے مرحلے تک ہی نا پہنچ سکا۔ میں نے اِس صورتِ حال کا اپنے باپ کے ساتھ ذکر کیا تو وہ قہقہہ لگا کے دیر تک ہنستا رہا۔ اُس نے بتایا کہ ایستادگی کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ ایک خوب صورت مرد میری بیوی کے ساتھ کچھ دِن گزارے گا اور میں ایک باپ بن جاؤں گا۔ اور یہ سلسلہ یوں ہی چلتا رہے گا۔ میرے اندر شاید ایسے آدمی کے جین تھے جسے یہ قابل قبول نہیں تھا۔ میں نے گھر سے لاتعلقی اختیار کر کے سڑکوں پر اپنی زندگی گزارنا شروع کر دی۔ مجھے دراصل ایسی عورت کی تلاش تھی جو میری محرومی کو قبول کرتے ہوئے میرے ساتھ زندگی گزار دے۔ مجھے نامردوں کی بنائی ہوئی اقتصادی سلطنت سے کوئی غرض نہیں تھی۔'' مشہد خاموش ہو گیا۔ فردوس کو محسوس ہوا کہ مشہد تھک گیا تھا۔ یہ گھر جو پہلے اُسے ایک آسیب لگا تھا اور پھر اس کی ہیبت میں اُسے اپنایت کا احساس ہونے لگا تھا؛ اُسے بار بار خیال آنا شروع ہو گیا تھا کہ یہ گھر تو اُس کا اپنا ہے، اُسے گھر میں ایک گہری آسودگی کا احساس ہوا تھا اور خیال آیا تھا کہ اگر وہ اِس گھر میں آ گئی تو اُس کی راتیں دنوں میں تبدیل ہو جائیں گی اور دِن راتوں میں۔ اُس وقت وہ ایک زندہ لاش کی طرح بے جان جسم کے ساتھ لیٹی ہوئی تھی۔ اِس محل سرا میں زندگی گزارتے ہوئے ایک آسودگی کی بھی ضرورت تھی جو اُسے تبھی ملنی تھی جب ایک کرائے کے سانڈ نے اُسے گابھن کرنا تھا؟ کیا یہ ایک ذلت تھی یا ایسی آسودگی کا آغاز جہاں اُس نے آسودگی کے لیے ہر وقت ترسنا تھا؟ ''میں تمھارے بدن کو محسوس کرنا چاہتا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ تم بھی جواب میں مجھے محسوس کرو گی۔ میرا ہر لمس تمھارے بدن

میں ایک آتش فشاں کو حرکت میں لائے گا اور لاوا بہہ نکلنا چاہے گا اور تمھارے محسوس کرنے سے میرے بدن میں بھی ایک آگ بھڑکے گی لیکن اُس آگ میں تپش نہیں ہوگی؛ وہ ایک طرح کی ٹھنڈی آگ ہوگی۔'' مشہد نے ایک لمبا سانس لیا۔ فردوس کے اندر مشہد کا تمام دکھ اور محرومی جاگ اٹھیں اور ساتھ ہی اپنی نا آسودگی نے بھی اُسے جھنجوڑ دیا۔ اُسے لگا کہ کسی طویل اختتام ہفتہ کے بعد کی سوموار کی صبح کو اُسے گہری نیند میں سے بیدار کر دیا گیا ہے۔ وہ کسی اجنبی مرد کا بچہ جن کے اِس گھر کی مالکن بن جائے گی اور ایسے ہی لوگوں کا طبقہ اُسے عزت کی نگاہ سے دیکھے گا۔ اُسے اپنے ساتھ لیٹا شریف النفس آدمی بے غیرت لگا۔ کیا وہ ایسے بے غیرتوں کی فہرست میں شامل ہو جائے ؟ اُس کے اگر بیٹی پیدا ہوئی تو یہ لوگ شاید اُس کی قیمت لگا دیں؟ وہ جہاں سے آئی تھی وہاں بیٹیوں اور بہوؤں کی حفاظت کی جاتی تھی لیکن اُسے دونوں خاندانوں میں مماثلت بھی نظر آئی؛ ایک خاندان اپنی جائداد سنبھالے رکھنے کے لیے حرامی بچے پیدا کیے جا رہا تھا جب کہ دوسرا اپنی جائداد کو سنبھالے رکھنے کے لیے بیٹیوں کو غیر شادی شدہ رکھنا چاہتا ہے۔ اُسے مشہد کے ساتھ لیٹے ہوئے اپنا آپ غیر محفوظ ہوتے ہوئے محفوظ محسوس ہوا۔ مشہد ایک لاتعلقی کے ساتھ چھت کو دیکھے جا رہا تھا۔ فردوس جان گئی کہ مشہد اُس وقت کس عذاب میں سے گزر رہا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اگر وہ کہے تو مشہد یہ گھر چھوڑ کے اُس کے ساتھ کہیں بھی چلا جائے گا لیکن وہ اُسے لے کے کہاں جائے گی؟ اُس کا باپ اور پھوپھی شاید دونوں کو ہی مروا دیں! اُسے مرنے کا بھی خوف نہیں تھا۔ اگر وہ مشہد کو قبول کر لے تو؟ اُسے محسوس ہوا کہ جسمانی نا آسودگی کا چابک ایک شوکر کے ساتھ اُس کی ننگی پیٹھ پر لگا ہے اور دوسری ضرب لگانے کے لیے خواہشوں کا دیوتا اُسے ہوا میں لہرا رہا ہے۔ فردوس کو لگا کہ اِک خواب ٹوٹ گیا ہے اور اُس ٹوٹے ہوئے خواب کی کرچیاں اُس کی خواہشات کے تلوؤں کو زخمی کر رہی ہیں۔ جوتا پہنتے ہوئے فردوس نے سوچا کہ وہ ''دس روپے کا نوٹ'' پڑھے گی۔

مشہد اُسی طرح چھت کو دیکھے جا رہا تھا۔

٭٭٭٭٭ اُستاد غیور نے ٹرک کو ڈھابے کے اندھیرے کونے میں لگایا۔ وہ لوگ دو مرتبہ پہلے بھی یہاں آ چکے تھے اور اُستاد نے ٹرک کو اِسی جگہ کھڑا کیا تھا۔ سفر کے دوران میں وہ جب بھی عارضی پڑاؤ کرتے، اُستاد ٹرک سے اُتر کے تھوڑے فاصلے پر پڑی چار پائیوں میں سے کسی ایک پر جا کے بیٹھ جاتا اور فیاض اُس کے وہاں بیٹھنے کی وجہ جانتا تھا۔ جیسے ہی اُستاد ٹرک سے اُتر کے کسی طرف جاتا تو اُسے فوراً چند کام کرنے ہوتے تھے جنھیں یاد رکھنے پر ہی اُس کی روزی کا دار و مدار تھا۔

ڈھابے کی ایک دیوار کے ساتھ پانچ ٹونٹیاں لگی ہوئی تھیں جن کے ساتھ ربڑ کے پائپ لگائے گئے تھے اور اُس وقت وہاں ایک پائپ فارغ تھا۔ فیاض نے اُس پائپ کو اپنے ٹرک تک کھینچا اور سب سے پہلے ونڈ سکرین پر دل کھول کے پانی ڈالا۔ اِس کے فوراً بعد اُس نے ٹائر دھوئے اور پھر بونیٹ کھولا۔ انجن میں سے گرمی کا ایک بھبھکا اُس کے چہرے سے ٹکرایا اور وہ اِس آگ کا عادی تھا۔ وہ بونیٹ ہمیشہ آخر میں کھولتا تھا تاکہ انجن کی گرمی کچھ کم ہو جائے۔ بونیٹ کھولنے کے بعد اُس نے ریڈیٹر کی جالیوں پر دیر تک پانی مارا اور ڈھکنا کھول کے چند منٹ پانی ڈالتا رہا۔ فیاض کے خیال میں تب تک موبل آئیل انجن سے واپس آ گیا ہوگا۔ پھر اُس نے موبل آئیل کی سطح دیکھی اور مطمئن ہو کے پانی بند کیا اور ٹرک میں اُستاد کی آواز کے انتظار میں بیٹھ گیا۔

عظمت سے آخری ملاقات کے دو دِن بعد رفیق اُسے ٹرکوں کے ایک اڈے پر لے گیا تھا جس کے مالک کے ساتھ اُس کی جان پہچان تھی۔ اڈے کے مالک نے اُسے سر سے لے کر پاؤں تک غور سے دیکھا؛ فیاض کو لگا تھا کہ گاؤں کا اشرف عرف اچھو قسائی کسی بیمار بکرے، چھترے، کٹے یا بچھڑے کو ایسے دیکھا کرتا ہے۔ مالک نے ایک بار اوپر سے نیچے سر ہلایا تھا اور رفیق کے ہونٹوں پر مطمئن سی مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔ فیاض کو اِس امتحان میں سُرخ رو ہونا عجیب سا لگا تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ وہ دنیا کا ہر کام کسی آزمائش میں سے گزرے بغیر بخوبی کر

سکتا تھا۔اڈے کے مالک نے اب فیاض کو نظر انداز کر کے کسی کو مخاطب کیے بغیر ایک لمبی آواز لگائی تھی اور کہا تھا کہ غیورا اُس سے آ کے ملے۔ فیاض ایک دم متجسس ہو گیا کہ غیورے کو بلا کے کیا کہا جانے والا تھا؟ غیورا ایک دراز قد آدمی تھا جس کا بایاں کاندھا تھوڑا سا نیچے کو جھکا ہوا تھا اور جس کے بال بکھرے ہوئے تھے اور جس کی آنکھوں میں نیند بھری ہوئی تھی اور جس کے ہونٹوں کے کناروں پر جھاگ جما ہوا تھا۔اڈے کے مالک نے فیاض کو کو غیورے کے سپرد کر دیا تھا جس نے اُسے مالک کی طرح اشرف عرف اچھو قسائی کی نظر سے دیکھا تھا اور جس کے ہونٹوں پر مشفقانہ قسم کی مسکراہٹ پھیل گئی تھی جس میں فیاض کو چھپی ہوئی اپنائیت نے متاثر کیا تھا۔ مالک کے کہنے پر اُس نے اُستاد غیور کے ساتھ تھوڑا جھک کے مصافحہ کیا تھا اور مالک نے سنجیدہ لہجے میں، جو حکم زیادہ تھا، کہا تھا کہ کسی قسم کی حرام تو پی نہیں ہونی چاہیے۔ اُستاد غیور نے مالک کی طرف دیکھے بغیر فیاض کو اپنے ساتھ چلنے کا اشارہ کیا تھا۔

اُستاد غیور نے اُسے دو دِن کی چھٹی دی تھی تا کہ وہ اپنے معاملات درست کر آئے کیوں کہ وہ کچھ نہیں کہہ سکتا تھا کہ اگلی بار کب گھر جائے! اِس مختصر لیکن اہم ملاقات میں رفیق بھی شامل تھا۔ اُستاد غیور نے اُس کی کوئی تنخواہ طے نہیں کی تھی لیکن اُسے یقین دہانی کروائی گئی کہ اُس کی ماں کو باقائدگی کے ساتھ پیسے ملتے رہیں گے۔ رفیق کے ساتھ مشورے کے بعد اُستاد غیور کو بھائی نصیر حسین کا پتا دے دیا گیا تھا جس پر اُس نے گاہے بگاہے رقم بھجواتے رہنا تھا۔ پھر اُستاد غیور نے ایک فلک شگاف قہقہہ لگاتے ہوئے کہا تھا کہ فیاض ایک طرح سے اُس کا سیر ی ہی تھا۔ گھر پہنچ کے جب فیاض نے ماں کو بتایا تھا تو وہ دیر تک روتی رہی تھی۔ اُسے اپنا خاوند یاد آ گیا تھا جسے صرف انقلاب کی فکر تھی جب کہ فیاض باغی ہونے کے ساتھ زندہ رہنے کے لیے محنت بھی کر رہا تھا۔ فیاض نے اُسے بتایا کہ اُس نے اپنے باپ کا ساتھ دیا تھا کیوں کہ ہر دور میں بغاوت کا طریقہ الگ ہوتا ہے۔ اپنے زمانے میں اُس کے باپ نے جو کیا وہ اُس وقت کا تقاضا تھا اور اب باغی کو زندہ رہنے کے لیے کام کرنے کی بھی ضرورت تھی۔ وہ اپنے باپ اور دادا کی طرح انقلابی اور باغی ہی تھا اور اُس نے گاؤں والوں کو ڈیرے والوں کے شکنجے سے چھڑانے کا عہد کر رکھا تھا جس کے لیے اُس کے پاس خاصی رقم کی ضرورت تھی جس کے لیے وہ محنت کر رہا تھا۔ ماں کو یہ سوچ سمجھنے میں کچھ وقت ضرور لگا لیکن پھر اُس کی آنکھیں اندھیرے میں بھی چمک اُٹھیں تھیں۔

فیاض نے کبھی طویل سفر نہیں کیے تھے۔ اُستاد غیور جس ٹرک کو چلاتا تھا اُس کا مالک اڈے والا تھا۔ وہ ٹرک اگر بالکل نیا نہیں تھا تو کسی بھی طرح اُسے پرانا نہیں کہا جا سکتا تھا۔ وہ ملک کے کونے کونے میں سفر کرتے۔ یہ سفر عموماً رات کو کیے جاتے۔ شروع میں فیاض کو رات کے سفر ایک بوجھ لگے۔ وہ تمام رات سڑک پر نظریں جمائے بیٹھا رہتا۔ اُسے سڑک اُتنی ہی نظر آتی جتنی پر روشنی پڑتی تھی۔ اُسے لگتا کہ وہ اندھیرے کے غار میں آگے ہی بڑھتے جا رہے تھے۔ اُستاد غیور بہت کم بات کرتا۔ اُس کی آنکھیں سڑک پر جمی ہوتیں اور اُنھیں جھپکے بغیر چلتا رہتا۔ فیاض نے سُن رکھا تھا کہ سانپ آنکھ نہیں جھپکتا اور اُستاد غیور کی آنکھوں کی شدت دیکھتے ہوئے اُسے احساس ہوتا کہ وہ دِن کو نظر آنے والے آدمی کو نہیں دیکھ رہا تھا۔ اُستاد غیور نے دونوں ہاتھوں سے سٹیرنگ وہیل مضبوطی سے تھامے ہوتا؛ اتنی مضبوطی سے کہ اُس کے ہاتھ پر رگیں پھولی ہوتیں۔ فیاض کو حیرت ہوتی کہ وہ اتنا عرصہ سٹیرنگ وہیل کو اتنی مضبوطی سے کیسے تھامے رکھتا تھا؟ ایک بار اُس نے اپنے ہاتھ کی مٹھیاں زور سے بھینچ لیں۔ وہ تیز رفتار ٹرک میں مٹھیاں بھینچے سامنے دیکھتا رہا بالکل جیسے اُستاد غیور دیکھ رہا تھا۔ اُس کی کوشش تھی کہ آنکھ تک نا جھپکے۔ تھوڑی ہی دیر بعد اُسے اپنی آنکھوں میں جلن کا احساس ہوا۔ وہ اپنی آنکھوں کو ایک بار جھپکنا چاہتا تھا۔ اُس نے اُستاد غیور کی طرف دیکھا، وہ ہر چیز سے بے نیاز سامنے دیکھے جا رہا تھا اور خاموش سڑک پر اُن کے ٹرک کے انجن کی ہی آواز تھی جب تک کوئی بس، ٹرک یا کار سامنے سے نا آجائے یا پیچھے سے آگے نا نکل جائے۔ آخر کار اُس نے آنکھ جھپک ہی لی اور جیسے ہی آنکھیں میچیں، پانی کے چند قطرے باہر نکلے۔ اب اُس کے ہاتھوں میں بھی درد ہونا شروع ہو گیا تھا۔ وہ مٹھیاں کھولنا نہیں چاہتا تھا لیکن اُسے اُنھیں بند رکھنا بھی ممکن نہیں لگ رہا تھا۔ آخر اُسے مٹھیاں کھولنا ہی پڑیں اور ساتھ ہی اُسے ایک گہرے سکون کا احساس ہوا۔ دِن وہ کسی اڈے پر سوئے گزارتے۔ فیاض کو نیند کم آتی، رات کو اُسے سفر میں سونے کی اجازت نہیں تھی۔ اُستاد یہی بتاتا کہ اُسے سوتے دیکھ کے وہ خود بھی سو جائے گا اور پھر یہ اُن کی زندگی کا آخری سفر ہی ہوگا۔ دِن کو جب اُستاد سویا ہوتا تو وہ بھی سونے کی کوشش کرتا۔ اُستاد کے خراٹے ایک تسلسل کے ساتھ آ رہے ہوتے اور اُسے حیرت ہوتی کہ وہ کروٹ لیے بغیر اتنا لمبا عرصہ کیسے سو سکتا تھا؟ پھر اُسے خیال آیا کہ وہ بالکل ویسے ہی سوتا تھا جیسے وہ رات کو ایک ہی آسن میں بیٹھے ٹرک چلاتا رہتا تھا۔ یہ سب سوچتے ہوئے اُسے ایک دِن نیند آ گئی اور شام

ہونے کے بعد اُستاد نے اُسے بمشکل جگایا۔ اُستاد اُسے جگانے کے بعد دیر تک ہنستا رہا۔ اُس نے کہا تھا کہ وہ اُس وقت ٹرک والا بن گیا تھا ورنہ پہلے ویگن کا چھوٹا ہی تھا۔ ٹرک والوں کے نا ہی نیند کے اوقات ہوتے ہیں اور نا ہی جاگنے کے۔ اُنھیں سوائے ٹرک چلاتے وقت کے، جب بھی موقع ملے سو جانا چاہیے۔ ایک اچھے ٹرک ڈرائیور کو یا سوئے ہوئے ہونا چاہیے اور یا ٹرک چلانے میں مصروف۔ اب فیاض کو جب بھی موقع ملتا، وہ سو جاتا لیکن راتوں کو اُستاد کی موجودگی اُسے ہمیشہ خائف رکھتی۔ اُسے محسوس ہوتا کہ اُس کے پاس وہ آدمی نہیں بیٹھا ہوا جسے اُس نے دِن کو سوئے ہوئے دیکھا تھا اور شاید اُس کے پاس اُس آدمی کا ہمشکل کوئی بھوت بیٹھا ہوا تھا۔ اُستاد جب ٹرک چلا رہا ہوتا تو اُس کے چہرے پر ارتکاز کی شدت ہوتی اور فیاض کو محسوس ہوتا کہ وہ کسی اجنبی کی معیت میں سفر کر رہا تھا۔ ایک دِن اُسے اُستاد کے ارتکاز کی وجہ سمجھ میں آ گئی۔ وہ سفر میں تھے اور آرام کے لیے رُکے تو اُستاد ٹرک فیاض کے حوالے کر کے سو گیا۔ شام کو اُستاد جاگا تو جاگنے کے بعد بھی نیند میں ہی تھا اور کبھی انگڑائی لیتا اور کبھی اُباسی۔ پھر اُس نے سگریٹ سلگایا۔ سگریٹ کے دھوئیں میں سے عجیب قسم کی بو آ رہی تھی؛ یہ وہ بو تھی جو اُسے اکثر ٹرک کے ڈرائیوروں کی محفل سے آیا کرتی تھی۔ وہ اچانک سمجھ گیا کہ وہ بو کیا تھی؟ اُسے جہاں تک یاد تھا اُستاد کو اُس نے کبھی سگریٹ پیتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ وہ ایک دم خوف زدہ ہو گیا؛ اُس کے خوف میں پریشانی کو بھی دخل تھا۔ اُس نے سوچا کہ اگر اُستاد نے اُسے بھی چند کش لگانے کو کہا تو؟ چند لمحے وہ اِس اُلجھن میں رہا اور پھر اُس نے فیصلہ کر لیا کہ چرس اگر ٹرکوں والوں کی زندگیوں کا حصہ تھا تو وہ بھی کش لگانے سے نہیں کترائے گا۔ اُسے اپنے اعتماد پر حیرت بھی ہوئی۔ اب راتوں کو سفر کے دوران میں وہ اُستاد کو ایک نئی نظر سے دیکھتا۔ وہ جان چکا تھا کہ چرس آدمی کی اہلیت اور کارکردگی میں اضافہ کرتی تھی۔ پہلے اُستاد کے چہرے پر ارتکاز کی شدت اُسے پریشان کر دیتی تھی لیکن اب وہ اُستاد کے چہرے کا غور سے مطالعہ کرتا رہتا۔ ٹرک کے کیبن کو سامنے لگے گچھوں کی روشنی نے روشن کیے ہوتا اور اندر سب چیزیں واضح نظر آتیں۔ فیاض، اُستاد کے جبڑوں کو حرکت کرتے دیکھتا اور کبھی دیکھتا کہ وہ ہونٹوں پر زبان کتنی بار پھیرتا تھا۔ اب اُستاد اُسے اُستاد کا ہم شکل جن لگنے کے بجائے اُستاد غیور ہی لگتا۔

اُستاد غیور کہیں نا کہیں سے اُس کی ماں کے لیے بھائی فقیر حسین کو پیسے بھجوا کے باتوں

باتوں میں سرسری طور پر اُسے بتا دیتا۔ فیاض کو اُس کا یہ طریقہ پسند بھی تھا؛ اُس نے کبھی جتایا نہیں تھا کہ وہ پیسے بھیج چکا ہے۔ وہ جب بھی اپنے شہر میں جاتے، اُستاد دو دِن اُسے گھر گزارنے کے لیے ضرور بھیجتا۔ اُستاد نے یہ کبھی نہیں بتایا تھا کہ ضلع کے کون سے علاقے کا رہنے والا تھا اور نا ہی اُس نے فیاض کے حالات جاننے کی کبھی کوشش کی تھی۔ فیاض گاؤں جا کے پہلا دِن گھر میں سوتے ہوئے اور ماں سے باتیں کرتے گزارتا۔ وہ گھر میں مالی حالات کی بہتری سے پیدا ہونے والی آسانیاں دیکھ سکتا تھا۔ ماں نے چولھے والی جگہ پر پکی اینٹوں کے چار تھم کھڑے کر کے اوپر چھت ڈلوائی تھی اور اُس تعمیر کے نیچے چولھا بن گیا تھا۔ ماں نے بتایا کہ اُس تعمیر میں رفیق نے اُس کی مدد کی تھی۔ ڈیرے والوں نے رفیق کو منع رکھنے کے لیے دھمکیاں بھی دی تھیں لیکن وہ کامیاب نہیں ہو سکے اور نتیجے میں اُنھوں نے اُن کے گھر بجلی پہنچانے والا تار پلگ سے نکال دیا تھا۔ اگلے چند دِنوں میں ہی بھائی فقیر حسین نے فیاض کی صحن میں مالکی کے کاغذات نکلوا کے ایک فیز کا بجلی کا میٹر لگوا دیا۔ ماں خوش تھی کہ اب وہ اپنی بجلی استعمال کر رہے تھے۔ ایک بارش میں اُن کی چھت اتنا ٹپکی کہ ماں کو بھائی فقیر حسین کے گھر پناہ لینا پڑی۔ رفیق نے اُس دِن اپنی ویگن نہیں چلائی اور رات گئے تک نئی چھت ڈال دی۔ اتفاق ایسا تھا کہ اُس کے بعد بارش نہیں ہوئی لیکن ماں اب اپنے آپ کو محفوظ محسوس کرتی۔

چھٹی کا اگلا دِن وہ بھائی فقیر حسین کی دکان پر گزارتا۔ دکان اب مزید بڑی ہو گئی تھی اور ایک کونے میں بھائی فقیر حسین کا بھانجا جو فیاض ہی کا عمر کا تھا، کمپیوٹر پر بیٹھا سٹاک کا ہر لمحے کا ریکارڈ رکھتا۔ فیاض کو بھائی فقیر حسین کی دکان پر بیٹھنے کا اب نیا تجربہ لگتا۔ پہلے وہ اونچے لہجوں میں بات کیا کرتے تھے اور اب اُن کی بات دھیمی آواز میں ہوتی۔ فیاض کا کبھی اونچی آواز میں بولنے کا بھی جی کرتا لیکن وہ کوشش کے باوجود ایسا نا کر سکتا۔ دکان کی نئی شان کی ہیبت اُسے ہر وقت مرعوب رکھتی۔

گاؤں میں ڈیرے والوں کا اثر اب واجبی سا رہ گیا تھا۔ بھائی فقیر حسین اب گاؤں کا سربراہ سمجھا جاتا تھا لیکن اُس نے یہ کبھی قبول نہیں کیا تھا۔ وہ فیاض کو یہی سمجھاتا کہ گاؤں کی چودھراہٹ کا وہی حق دار تھا، اُس نے تو یہ بطور امانت سنبھالی ہوئی تھی۔ وہ بتاتا کہ بعض اوقات بادشاہ جلا وطن ہو جاتے ہیں اور باشعور عوام اُن کا انتظار کرتے ہیں۔ گاؤں کا ہر فیصلہ وہ ڈیرے

والوں سے ہی کرواتا لیکن وہ فیصلہ اُس کی مرضی کے مطابق ہوتا۔ بظاہر گاؤں کے چودھری ڈیرے والے ہی تھے لیکن کوئی بھی فریاد یا مسئلہ سیدھا اُن کے پاس نہیں جاتا تھا۔

ماں کبھی کبھار بھائی فقیر حسین کے گھر جاتی۔ رفیق کے والدین فوت ہو چکے تھے اور اُس نے اُن کی زندگی میں ہی اپنے باپ کی مرضی کے خلاف عظمت سے شادی کر لی تھی۔ بھائی فقیر حسین نے کافی دوڑ دھوپ کے بعد گاؤں سے شہر جانے والی سڑک مرمت کروائی تھی اور رفیق کے مقابلے میں دو ویگنیں اور بھی چل پڑی تھیں۔ لوگ اِس مقابلے سے خوش تھے اور اُنھیں اب شہر جانا یا آگے کہیں اور جانا دشوار نہیں رہا تھا۔ اُن سب کو بھائی فقیر حسین کی منصوبہ بندی کا علم تھا اور وہ اُسے قدر کی نگاہ سے دیکھتے۔

ماں اپنے پیسے بھائی فقیر حسین کے پاس بطور امانت رکھتی۔ بھائی فقیر حسین نے فیاض کو بتایا کہ وہ ایک بنک کی شاخ گاؤں میں کھلوانے کی کوشش کر رہا تھا اور جلد ہی محفوظ پیسے کی سہولت گاؤں میں میسر ہو جائے گی۔ اُس نے ڈسپنسری بھی منظور کروائی تھی جو جلد ہی شروع ہو جائے گی۔ ہائی سکول پہلے قائم ہو چکا تھا۔ فیاض جب یہ ترقی دیکھتا تو اُسے یقین نا آتا۔ اب وہ دو صوبوں کے کئی ضلعوں کے چکر لگاتا رہتا تھا اور دور دراز کے دیہات میں اُسے اپنے گاؤں جیسی ترقی کہیں نظر نا آتی۔ وہ کئی بار سوچتا: کیا وہ اِس قابل تھا کہ گاؤں کا چودھری بنے؟ اُسے ایسے گاؤں کا چودھری بننے پر فخر بھی محسوس ہوتا جہاں کسی جلاوطن بادشاہ کی واپسی کی طرح اُس کا انتظار کیا جا رہا تھا۔ بھائی فقیر حسین اُس کے لیے یہ سب کیوں کر رہا تھا؟ وہ اُسے پوچھنا چاہتا تھا اور اُسے جھجک بھی تھی۔ ایک دفعہ فیاض نے پوچھ ہی لیا۔ بھائی فقیر حسین کچھ دیر اُسے دیکھتا رہا۔ اُس کی آنکھوں میں ایک چمک اور ہونٹوں پر شرارت بھری مسکراہٹ تھی۔ فیاض، بھائی فقیر حسین کو ایسے دیکھتے ہوئے دیکھ کے کچھ پریشان ہوا۔ اُسے کسی نا کسی جواب کی اُمید تھی لیکن ایسے دیکھے جانا فیاض کو اپنا مذاق اُڑائے جانا لگا۔ اُس کے چہرے پر ناپسندیدگی تھی اور وہ خاموش سنجیدگی کے ساتھ زمین کو تکتا تھا۔ تبھی بھائی فقیر حسین نے اپنا گلا صاف کیا اور فیاض نے چونک کے اُس کی طرف دیکھا۔

''ہم ایک تبدیلی لانا چاہتے ہیں اور اِس تبدیلی کے لیے ہمیں ایک ایسے سربراہ کی ضرورت ہے جو ہر کسی کو قبول ہو۔ تمھارا شجرہ وہ سب مہیا کرتا ہے اور قابلِ تعریف بات یہ ہے کہ کسی

کو تمھارے سربراہ بننے پر اعتراض نہیں۔ ایک تو تمھارا اپنا خاندانی پس منظر سب کی نظر میں ہے۔ ہر کوئی جانتا ہے کہ تمھارے دادا اور والد نے اپنے اصولوں کے لیے جان دے دی لیکن کسی کے آگے سر نہیں جھکایا۔ رفیق کو تم جانتے ہو! اُس کا باپ اپنی زندگی میں ہمارا مخالف رہا ہے؛ ہمیں یہاں تک خبر ملی ہے کہ وہ ڈیرے والوں کا مخبر بھی تھا۔'' بھائی فقیر حسین خاموش ہوا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ رفیق بھی ایک کونے میں بیٹھا ہوا ہے۔ اپنے باپ کا ذکر سُن کے اُس نے کھانسنا شروع کر دیا اور بھائی فقیر حسین بھی اُس ہنسی میں شامل ہو گیا۔'' دوسری بات یہ کہ ہم لوگوں نے تمھارے متعلق ہر وقت بات کرتے ہوئے تمھیں باقی لوگوں سے مختلف بنا کے تعمیر کیا ہے۔ ہمارا ایسا کرنا کسی حد تک درست بھی ہے اور غلط بھی۔ ابھی تک تو تم ایسے ہی ثابت ہو رہے ہو جیسا کہ ہم کہہ رہے ہیں اور لوگ بھی اپنی رائے قائم کر رہے ہیں۔ کل اگر تم اپنے باپ اور دادا کے مخالف ڈیرے والوں جیسے نکلے تو سب ایک شدید ضعیف کا شکار ہو جائیں گے۔ تمھارا اُس طرح کا رویہ ہماری محنت کو خاک میں ملا دے گا۔ ہم نے تمھیں ایسے پروان چڑھانا ہے کہ تم اُس طرح کے آدمی بنو جو سب چاہتے ہیں۔ ہم سب اپنے طور پیسے اکٹھے کر رہے ہیں۔ تمھارا گھر پہلے سے بہتر ہو گیا ہے اور وہاں بظاہر غربت کے آثار اب نہیں رہے۔ آنے والے وقت میں ہم نے ڈیرے میں تمھارا حصہ نکلوا لینا ہے اور جوں ہی تمھارا حصہ الگ ہوا تم گاؤں میں واپس آ جاؤ گے۔ ایک دعوت ہو گی جس میں علاقے کے سب معتبروں کو بلایا جائے گا جن میں ڈیرے والے بھی بلائے جائیں گے۔ وہ اگر آ گئے تو ذلیل ہوں گے اور اگر نہ آئے تو بھی ذلیل ہوں گے۔ تب تم اپنی کنڈکٹری چھوڑ دو گے اور یہ گاؤں تمھارے حکم پر چلے گا۔ تم بھی ایک چھوٹا سا ڈیرہ بناؤ گے۔'' فیاض، بھائی فقیر حسین کی درستی کرنا چاہتا تھا۔ فیاض کنڈکٹر نہیں تھا، وہ تو اب چھوٹا ڈرائیور بن چکا تھا۔ اُستاد کو اُس پر مکمل اعتبار تھا۔ رات کو ٹرک چلاتے ہوئے اُستاد کبھی کبھار اُس کی طرف دیکھ بھی لیتا۔ اتنے طویل سفر کرنے کے بعد اُس نے خود کو ایسے بنا لیا تھا کہ اُسے اونگھ میں پیغام مل جاتا کہ اُستاد اُس کی طرف دیکھنے والا ہے اور اُستاد جب بھی اُس کی طرف دیکھتا، فیاض جاگ رہا ہوتا اور اُس کی نظر اُستاد کے ساتھ ملتی۔ اُستاد ہلکا سا مسکرا دیتا۔ ایک دِن اُستاد نے باتیں کرنا شروع کر دیں۔ یہ باتیں کسی اطلاع کے بغیر شروع ہوئیں۔ اُستاد نے اپنے بچپن کی محرومی کا ذکر شروع کیا۔ فیاض کا بچپن بھی محرومی میں گزرا تھا لیکن اُس کی ماں بچپن کی اُس محرومی کے سامنے سینا تانے کھڑی تھی۔ اُستاد کی ماں نے

اُس کے باپ کے مرنے کے بعد دوسری شادی کر لی تھی۔ اُستاد کو اُس کے ہم عمر اِس شادی کی وجہ سے تنگ کرتے اور ایک وقت آیا کہ اُس نے اُن کے ساتھ کھیلنا ترک کر دیا۔ اب وہ دنیا میں بالکل اکیلا تھا۔ اُسے ماں بُری لگتی اور اپنا سوتیلا باپ اُس سے بھی زیادہ۔ اُسے اپنے گھر سے نفرت ہو گئی جہاں اُس کی ماں اُسے سلا کے اپنے خاوند کے ساتھ جا کے لیٹ جاتی۔ وہ اُن کے سو جانے تک دونوں کی سرگوشیاں سنتا رہتا۔ یہ سرگوشیاں سنتے ہوئے اُس کے کانوں میں سیٹیاں بجنے لگتیں۔ وہ اُسی وقت گھر سے بھاگ جانا چاہتا تھا لیکن دونوں کا ڈر اُسے روکے رکھتا۔ ایک دِن وہ گھر نہیں گیا اور شام کو ایک راستے پر چلتے ہوئے کسی دور کی آبادی میں پہنچ گیا جہاں بھوک نے اُسے بدحال کر دیا۔ وہ پہلی بار تھی کہ اُس نے کئی گھروں کا دروازہ کھٹکھٹا کے کھانے کے لیے روٹی مانگی۔ اُسے کہیں سے کچھ مل جاتا اور کہیں پر دھتکار دیا جاتا۔ کچھ دنوں کے بعد اُسے وہاں سے روٹی ملنا بند ہو گئی تو وہ اگلی بستی میں چلا گیا۔ اب یہ اُس کا معمول بن گیا۔ وہ ایک بستی میں کچھ دِن گزارتا اور پھر کسی نئی بستی کی طرف چل پڑتا۔ اِس طرح بستی بستی پھرتے وہ شہر میں پہنچ گیا جہاں اُسے پولیس نے پکڑ لیا اور جب اُس سے کوئی واردات برآمد نا ہوئی تو اُسے چھوڑ دیا۔ اب اُستاد اِس دربدری سے تنگ آ چکا تھا۔ اُس نے کہیں کام کرنے کا فیصلہ کر لیا اور اُسے ایک سروس سٹیشن پر کاروں کے فُٹ میٹ نکالنے اور دھو کے رکھنے کے لیے رکھ لیا گیا جس کے بدلے میں اُسے دوپہر کا کھانا ملتا۔ وہ ایک آدھ روٹی یا نان رات کے لیے چھپا کے رکھ لیتا جو وہ پانی کے ساتھ حلق سے نیچے اُتار لیتا۔ کار میں کبھی اُسے ریزگاری یا ایک آدھ نوٹ بھی مل جاتا۔ اُسے نوٹوں کی پہچان ہو گئی تھی اور وہ ہمیشہ چھوٹا نوٹ ہی پار کرتا۔ ایک دِن ایک مستری اُسے ساتھ لے گیا جو رات کا کھانا بھی دیتا اور کچھ پیسے بھی۔ اُس نے جیک لگانا، ٹائر کھولنا اور ٹائروں والی دکان سے ایئر کلینز کو ہوا سے صاف کرنا سیکھ لیا۔ ایک دِن اُسے ایک ٹرک والا ساتھ لے گیا جس نے اُسے اپنا نڈا بنا لیا۔

فیاض کو یہ سُن کے حیرت بھی ہوئی شرم ساری بھی۔ اگر اُس کے ساتھ ایسا کچھ ہوا ہوتا تو وہ کسی کو بھی اِس بارے میں نا بتاتا۔ اُستاد نے یہاں تک کی بات کئی راتوں میں سنائی۔ یہ باتیں کرتے ہوئے اُستاد کی نظر سڑک سے صرف اُسی وقت ہٹتی جب وہ ایک سیکنڈ کے لیے اُس کی طرف دیکھتا۔ فیاض فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ اُس کی نظر میں اُستاد کی عزت میں کمی ہوئی تھی یا اضافہ۔ جب وہ اُستاد کی طرف دیکھتا تو اُس کے ذہن میں ایک دم آواز آتی کہ وہ کسی کا نڈا رہا ہے

اور ساتھ اُس کی پوری زندگی نظر کے سامنے دوڑ جاتی۔ وہ محسوس کرتا کہ اُستاد کی زندگی میں صرف کمیاں ہی کمیاں تھیں۔ اب اُسے اُستاد کے ساتھ اُس دوری کا احساس نہیں رہا تھا جو وہ پہلے محسوس کیا کرتا تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ اُستاد سب لوگوں سے مختلف ہے۔ وہ یقیناً بھائی فقیر حسین اور رفیق سے مختلف تھا جو اُس کے ساتھ باتیں کیا کرتے تھے اور منصوبوں میں اُس کی رائے لیا کرتے تھے۔ اُستاد کی خاموشی نے اُن کے درمیان میں ایسی دیوار کھڑی کر دی تھی جس کے پار دیکھا تو جا سکتا تھا لیکن اُسے عبور نہیں کیا جا سکتا تھا۔ وہ برابر بیٹھے ہوئے بھی بہت فاصلے پر ہوتے تھے۔ اُستاد کی باتوں نے دیوار تو نہیں گرائی تھی لیکن وہ اُستاد کی آواز سن سکتا تھا۔

اُستاد نے اُسے عورتوں کے قصے سنانے شروع کر دیے۔ وہ عورتوں کے جسموں کی تصویر کھینچتا تو اُس کے ذہن میں ماں، ڈیرے والوں کی عورتیں، بھائی فقیر حسین کی بیوی اور عظمت کے جسم آ جاتے۔ اِن میں سے کچھ جسم اُسی طرح کسّے ہوئے تھے جیسے اُستاد بیان کرتا تھا اور کچھ اِس طرح لٹکے ہوئے تھے کہ اُستاد نے ویسے جسموں کی کبھی بات ہی نہیں کی تھی۔ اُستاد کئی راتیں ایک ہی جسم کو کھولتے ہوئے لگا دیتا اور اب فیاض کا جی کرتا کہ اُستاد سب چھوڑ کے عورتوں کی ہی باتیں کرے۔ اُستاد ایک لاتعلقی کے ساتھ بولتا جاتا اور فیاض اُس کے لفظوں سے اپنے ذہن میں عورت کی تصویر بناتا جاتا۔ جوں جوں یہ تصویر مکمل ہوتی جاتی اُسے ایک بے چینی تنگ کرنا شروع کر دیتی۔ اُس کے بدن میں ایک تناؤ کی کیفیت ہوتی اور کانوں میں سیٹیاں بجنے لگتیں۔ جب پہلی بار اُس کے کان میں سیٹیاں بجیں تو اُسے اُستاد کی وہ بات یاد آ گئی جب وہ اِن سیٹیوں کے ڈر سے گھر سے بھاگ گیا تھا۔ فیاض کو ایک دم خیال آیا کہ اُستاد کی ماں تو اب تک بوڑھی ہو چکی ہو گی! پھر اُس نے سوچا کہ شاید وہ مر ہی گئی ہو۔ اُسے اپنی ماں شدت سے یاد آنے لگتی۔

اُستاد عورتوں کے ساتھ اپنی ہم بستری کی تفصیل سنانے لگا۔ فیاض کے کان گونج رہے ہوتے، دِل کی دھڑکن تیز ہوئی ہوتی، بدن میں تھکا دینا والا تناؤ ہوتا، وہ چاہتا کہ اُستاد کوئی اور بات سنائے لیکن وہ یہ باتیں سنے بھی چلے جانا چاہتا۔ یہ باتیں کرتے ہوئے اُستاد ٹرک کی رفتار تیز کر لیتا یا پھر اُسے پتا ہی نہیں چلتا تھا کہ رفتار تیز ہو گئی ہے۔ وہ بتاتا کہ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر واقع قصبوں میں ایک آدھ جگہ ایسی ہوتی تھی جہاں ہر وقت عورتیں تیار ملتیں۔ وہ سفر کو کچھ دیر روک کے اُن گھروں میں چلے جاتے اور اُن عورتوں کے جسم اُن کی تمام تھکاوٹ اُتار کے اُن کے اندر

تازگی بھر دیتے۔ فیاض سوچتا کہ وہ عورتیں تازگی کیسے بھرتی تھیں؟ کئی بار اُستاد یہ بھی بتاتا کہ وہ ہر
ست نچوڑ لیتی تھیں۔

جب سے ملک میں ایمان داری کی جگہ بے ایمانی نے لے لی تو پہلا کام اُن آباد گھروں کو اُجاڑنے کا کیا گیا۔ وہ بتاتا کہ ایسے گھر اُس جیسے ''تھڑے'' ہوئے لوگوں کو زندہ رکھے ہوئے تھے۔ اب تو وہ بس صرف ڈرائیوری جوگے ہی رہ گئے تھے۔ فیاض کو اُستاد کی باتوں میں مایوسی محسوس ہوتی۔ وہ سوچتا کہ اُستاد جس محرومی کی وجہ سے گھر سے بھاگا تھا وہ آج تک پوری نہیں ہوئی تھی۔ اُسے یہ بھی خیال آتا کہ جب اُسے گاؤں بلالیا گیا تو وہ اُستاد کو بھی ساتھ لے جائے گا۔ پھر اپنے اِس خیال کو رد کر دیتا کہ اُستاد کی نظر میں ہر عورت صرف بستر پر ہی مزا دیتی ہے اور وہاں کئی عورتیں اُس کے بہت قریب تھیں۔

اُستاد، فیاض سے اُتنا ہی دور تھا لیکن وہ خود کو اُستاد کے قریب محسوس کرتا۔ اُستاد کی باتیں کبھی ختم ہی نا ہوتی تھیں؛ وہ اُنھیں سنتے جاتا اور سوچتا کہ کچھ اپنی بھی سنائے۔ اُستاد کیا سوچے گا کہ اُس کے چھوٹے کے پاس سنانے کو کچھ بھی نہیں؟ فیاض سوچتا کہ وہ کیا بتائے؟ بھائی فقیر حسین کی بیوی کے ساتھ مل کے وہ کیسے رویا تھا یا عظمت کے ساتھ بیٹھک میں اُس کی ملاقات کس طرح ہوئی تھی؟ دونوں عورتوں کے بدنوں سے اُٹھنے والی خوشبو میں ایک تازگی تھی، ایسی تازگی جس کا ذکر اُستاد نے کبھی نہیں کیا تھا۔ وہ ہمیشہ اُن خوشبوؤں کا ذکر کرتا جو فیاض کو ایک طرح سے باسی لگا کرتیں۔ اُس کے نزدیک وہ دونوں ایسی عورتیں تھیں جن کے لیے اُس کے دِل میں احترام تھا۔ اُستاد اپنی عورتوں کا ذکر کبھی نفرت اور کبھی مذاق اُڑانے والے انداز میں کرتا۔ اُسے اُن کے ساتھ کوئی دل چسپی نہیں تھی۔ وہ تو ایک ڈار میں اُڑتے ہوئے پرندوں کی طرح تھے جو اپنی جگہیں بدلتے رہتے ہیں۔

اپنے معمول سے فارغ ہونے کے بعد فیاض ٹرک میں اپنی سیٹ پر بیٹھا یہ سب کچھ سوچ رہا تھا۔ وہ یہ سب اُس دِن ہی نہیں سوچ رہا تھا، وہ یہ سب اُس تمام وقت میں سوچتا جب وہ رُکے ہوئے ہوتے اور وہ جاگ رہا ہوتا۔ جب وہ سو جاتا تو وہ خواب دیکھتا جو اِن باتوں سے بالکل مختلف ہوتے۔ وہ اُستاد کی لمبی تان سی آواز کے انتظار میں یہ سوچتے ہوئے سو گیا تھا۔ ایسا اکثر ہو جاتا تھا۔ اُستاد اپنے نیم اُجالے کونے میں چرس سے بھرا سگریٹ پیتا اور جب نشہ اُس کی زبان

میں لکنت لے آتا تو اُسے ایک لمبی ہاک لگا تا اور فیاض اگر گہری نیند بھی سو رہا ہوتا تو فوراً جاگ جاتا۔ اب بھی ایسے ہی ہوا۔ وہ سو رہا تھا کہ اُستاد کی کی آواز نے اُسے مکمل طور پر جگا دیا۔ اُس نے دیکھا کہ اُس کے سوئے رہنے کے عرصے میں کئی اور ٹرک بھی وہاں آ گئے تھے۔ وہ اُس اندھیرے کونے کی طرف چل پڑا جہاں اُستاد کو ہونا چاہیے تھا۔ وہاں چند چار پائیاں بچھی ہوئی تھیں جن پر چند لوگ نیم دراز تھے۔ وہ دور سے اُنھیں اچھی طرح پہچان نہیں سکا جس کی وجہ اندھیرا اور کچھ نیند کی غنودگی تھی۔ وہ جب قریب ہوا تو سب لوگ اُسے صاف نظر آنے لگے۔ چند ڈرائیور چھوٹوں کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ لوگ اپنی اپنی چار پائیوں پر ایسے بیٹھے ہوئے تھے جیسے کسی گہری گفتگو میں مصروف ہوں۔ اُستاد کے ساتھ بھی کوئی نیم دراز تھا اور وہ اُس کے اوپر جھکا کوئی بات کر رہا تھا۔ فیاض کے لیے یہ نظارہ نیا ہونے کے ساتھ عجیب سا بھی تھا۔ اُس نے اُستاد کو کبھی کسی کے اتنا قریب نہیں دیکھا تھا۔ ایک آدمی چار پائی پر اکیلا بیٹھا مسکراتے ہوئے اُس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اُسی مسکراہٹ میں اُس نے فیاض کو اپنے پاس بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اُستاد اُس کی طرف دیکھ کے مسکرا رہا تھا۔ اُستاد کی مسکراہٹ نے اُس کی جھجک ختم کر دی اور وہ اُس چار پائی پر بیٹھ گیا جس پر بیٹھنے کا اُسے کہا گیا تھا۔ اُس آدمی نے فیاض کا ہاتھ پکڑ کے اپنی ٹانگ کے اوپر رکھا اور وہ اُس وقت وہاں بجی محفل کا مطلب سمجھ گیا۔ فیاض نے اپنا ہاتھ چھڑایا اور اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اُس آدمی کی گرفت میں سختی نہیں تھی لیکن فیاض نے اُس کا ہاتھ پوری طاقت کے ساتھ جھٹکا تھا۔ اُستاد نے اُسے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور اُس آدمی نے مسکراتے ہوئے اپنا ہاتھ بڑھایا جسے فیاض نے پھر جھٹک دیا۔ اُستاد اب اُٹھ کھڑا ہوا اور اُس کے چہرے پر انتہا کا غصہ تھا۔ فیاض اور وہ چند لمحے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے اور پھر ایک دم اُستاد نے ''بہن چود'' کہتے ہوئے اُس کی طرف چھلانگ لگائی۔ فیاض پہلے ہی تیار تھا اور وہ سڑک کی طرف بھاگ نکلا۔ اُسے اپنے پیچھے بھاگتے قدموں اور ''یہ بات ختم ہو گئی ہے۔'' کی آوازیں آئیں۔ وہ رکا نہیں۔ وہ ایک سمت کو بھاگ نکلا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ اُس کا رُخ شمال کی طرف تھا یا جنوب کی طرف، یا وہ مشرق کی طرف بھاگ رہا تھا یا مغرب کو؛ وہ بس بھاگے جا رہا تھا.....!

......وہ گھر جودہ ایکڑ کینوں کے باغ کے شروع میں تعمیر کیا گیا تھا۔ گھر کے ساتھ سے راستہ باغ کے درمیان تک جاتا جہاں موسم میں کنوؤں کے ڈھیر لگے ہوتے اور ساری رات ٹرک کنو اُٹھا کے منڈی تک ڈھوتے رہتے۔ گھر میں داخل ہونے کے لیے لوہے کا ایک مضبوط پھاٹک تھا اور گھر کے گرداگرد ایک بلند دیوار تعمیر کی گئی تھی۔ وہ ایک وسیع رقبے پر تعمیر کیا گیا چھوٹا سا اور آرام دہ گھر تھا جس میں گلاب کے پھولوں کا ایک قطع تھا اور ہر پھل اور اُس پھل کی ہر قسم کا ایک ایک پودا لگایا گیا تھا۔ اُن درختوں میں سارا سال کوئی نا کوئی پھل ضرور لگا ہوتا۔ پھل دار درختوں کے علاوہ سامنے والے اور پچھلے صحن میں سایہ دار لگے ہوئے گرمیوں میں گرمی کی شدت کو زائل کرنے میں کافی موثر تھے۔ پچھلے صحن کے ایک کونے میں چھوٹا سا ٹیوب ویل لگا ہوا تھا جو صرف آبیاری کے لیے استعمال ہوتا۔ اُس ٹیوب ویل کے پاس ہی ڈیزل کا ایک جینیریٹر تھا جو بجلی بند ہونے کی صورت میں گھر کو اندھیرے میں نا ڈوبنے دیتا جب کہ اردگرد اندھیرے کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر ہوتا اور اِس سمندر کے وسط میں گھر روشنی کے ایک جزیرے کی طرح تھا۔

بجلی بند ہونے کے بعد معلوم ہوا کہ جنریٹر کے لیے ڈیزل کا بندوبست نہیں کیا گیا تھا اور بجلی کے آنے تک گھر نے اردگرد پھیلے اندھیرے کے سمندر کا حصہ ہونا تھا۔ یہ ایک پریشان کن صورتِ حال تھی اور معمول سے ہٹے ہوئے ہر واقع کے ظہور پذیر ہونے پر اُس دِن بھی فردوس کو اپنے باپ کی یاد آئی۔ پھوپھی فیروزہ، باپ کے ہوتے ہوئے بھی گھر کے سیاہ سفید کی مالک تھی اور یا پھر فیروز خاں نے یہی تاثر دیا ہوا تھا۔ یہ کبھی نہیں ہوا تھا کہ کسی وقت گھر میں کوئی ضرورت کی چیز موجود نا ہو۔ یہ بات لوگوں کے لیے باعثِ حیرت بھی تھی کہ شہر سے دور رہتے ہوئے وہ لوگ یہ سب کیسے کرتے تھے؟ کوفی، کریم، مچھلی یا جو بھی کسی کا کھانے یا پینے کو جی چاہے، موجود ہوتا۔ ڈیزل یا لالٹینوں کے لیے مٹی کے تیل کا ہونا کبھی سنا ہی نہیں گیا۔ فیروز خاں ایک رات چھاتی میں شدید درد ہونے کے باعث فوت ہو گیا۔ درد اتنا شدید تھا کہ جیپ یا کار نکالنے سے پہلے ہی وہ فوت

ہو گیا۔ اُس کے فوت ہوتے ہی گھر میں بدانتظامی اور سازشوں کا آغاز ہو گیا۔ پھوپھو فیروزہ اُتنی منظم نہیں تھیں جتنا اُن کے متعلق کہا جاتا تھا۔ اُنھیں گھر کے معمولات کو برقرار رکھنے سے زیادہ فردوس کی مصروفیات کے بارے میں جاننے میں دل چسپی تھی۔ فردوس نے مشہد کے ساتھ تعلق ختم تو کر لیا تھا لیکن وہ اُسے بھول نہیں پائی تھی۔ اُس کا معصومیت سے ٹکٹکی لگائے کسی چیز کو دیکھتے جانے کا خیال فردوس کی چھاتی میں ایک خلا پیدا کر دیتا جسے وہ لمبے لمبے سانس لے کے بھرتی۔ وہ ایک بے ضرر اور حساس آدمی تھا جس کا اُن حالات پر کوئی اختیار نہیں تھا جنھوں نے اُس کی زندگی کی ہر دل چسپی اور لطف کو اُس سے چھین لیا تھا۔ وہ کبھی اُس کے پاس جانے کا بھی سوچتی لیکن پھر عدم تکمیل اُس کی راہ میں بُری طرح حائل ہو جاتی۔

پھوپھو فیروزہ نے اعلان کر دیا کہ وہ فردوس کی شادی کے خلاف تھی بالکل اُسی طرح جیسے اُس کا بھائی اُس کی شادی کے خلاف تھا۔ مشرق، مغرب، شمال اور جنوب میں پھیلے ہوئے کھیت اُس کے باپ کی ملکیت تھے جس کی اُس کے بھائی نے اُس کی شادی نا کر کے حفاظت کی تھی اور اب اِس حفاظت کی تمام تر ذمے داری اُس کے سر پر تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اُس کے بھائی کا داماد آ کے سب کچھ اپنے نام کروا لے اور اُس کے باپ کا کہیں نام ہی نا رہے۔ فردوس نے اپنی پھوپھی کے اِس فیصلے کے خلاف احتجاج تو نہیں کیا۔ اُسے احتجاج کرنا مناسب نہیں لگا کیوں کہ مشہد کی مثال اُس کے سامنے تھی۔ اُس نے شادی نا کر کے کسی سانڈ سے اپنی بیوی کو گابھن کروانے سے بچانا تھا۔ اُس کی جائداد کا بھی کوئی وارث نہیں ہونا تھا اور فردوس کے باپ اور دادا کی جائداد بھی بے وارثی ہی رہ جانی تھی۔

یہ بھی سننے میں آ رہا تھا کہ پھوپھی گو اب جوان نہیں رہی تھی لیکن اُس کا منشی نذر کے ساتھ کسی قسم کا خاص تعلق تھا کیوں کہ وہ اب ہر وقت بجی سنوری رہتی اور منشی بھی ہر وقت کھاتا ہاتھ میں لیے اُس کی تلاش میں ہوتا۔ فردوس کو یہ سوچ کے گھن بھی آتی۔ وہ سوچتی کہ جسم کا تعلق مرد اور عورت کے لیے انتہائی نازک رشتہ ہوتا ہے اور دونوں کو اسے اپنی حیثیت کے کسی فرد کے ساتھ جوڑنا چاہیے۔ جس طرح کسی بڑے زمین دار کا اپنی کسی ملازمہ کے ساتھ بستر پر وقت گزارنا اُس کے مقام سے بہت نیچے ہے اِسی طرح فیروزہ کا منشی نذیر کے ساتھ تعلق اُس کے شایانِ شان نہیں۔ وہ اپنی پھوپھو کو ہمیشہ اعلیٰ ظرف عورت سمجھتی آئی تھی اور اب بعض اوقات اُسے اُس کے پاس بیٹھے

ہوئے اُس کے جسم سے وہی بو آتی جو منشی نذیر کے پاس سے گزرنے پر آتی تھی۔

پھوپھو فیروزہ اب فردوس سے بے نیاز تھی اور اُس کا زیادہ وقت منشی کی صحبت میں گزرتا۔ گھر اب پہلے کی طرح منظم نہیں رہا تھا گو فردوس، پھوپھو سے چوری، ہر نظر انداز کیے جانے والے پہلو کو تکمیل میں رکھنے کی کوشش کرتی۔ منشی کے بیٹے کے پاس اب ایک موٹر سائیکل تھا جسے وہ گاؤں کی گلیوں میں چلاتا پھرتا۔ فردوس جانتی تھی کہ موٹر سائیکل کے خریدنے میں منشی کی بددیانتی اور پھوپھو کی خاندانی وقار کے ساتھ بے وفائی شامل تھی۔ وہ تو اِس گھر کی فصیل نما دیواروں کے اندر قید تھی اور نہیں جانتی تھی کہ باہر لوگ کیا باتیں کر رہے ہوں گے لیکن اُسے اتنا اندازہ تھا کہ باتیں ضرور ہو رہی ہوں گی۔ یہ باتیں سوچتے ہوئے اُسے مشہد یاد آتا جو ایک معصوم آدمی تھا اور زندگی نے اُس کے ساتھ اُتنا بڑا انداق کیا تھا جتنا بڑا اُس کے ساتھ دھوکہ۔ وہ دونوں ایسی نا آسودہ روحیں تھیں جن میں مشہد کبھی آسودگی حاصل نہیں کر سکتا تھا اور وہ جب چاہے آسودہ ہو سکتی تھی۔ اُسے اپنا آسودہ ہونا غیر اخلاقی ہونے کے ساتھ غیر سماجی بھی لگا۔ اگر آسودگی زندگی کی منزل نہیں تو مشہد کے ساتھ نا آسودہ رہتے ہوئے بھی شاید وہ ذہنی آسودگی حاصل کر سکے۔ اُس نے مشہد سے ملنے کا فیصلہ کر لیا۔

پہلے اُس نے سوچا کہ پھوپھو سے اجازت لے پھر اُسے خیال آیا کہ وہ چھوٹی ضرور تھی لیکن گھر کی مالکن وہی تھی اور جب جو چاہتی کر سکتی تھی۔ اُس نے سوچا کہ وہ کار میں جائے گی۔ اُس نے ڈرائیور کو صبح کا پابند کیا اور پھوپھو کے جاگنے سے پہلے ہی شہر کے لیے نکل پڑی۔ وہ کہاں جائے؟ کیا وہ مشہد کو اُن چائے خانوں میں ڈھونڈے جہاں وہ چائے پیا کرتے تھے یا اُن جگہوں پر جائے جہاں وہ کھڑا اپنے سامنے دیکھتا رہا کرتا تھا؟ فردوس نے مشہد کے گھر جانے کا فیصلہ کیا۔ وہ مشہد کے گھر پہنچی تو اُسے باہر روکا نہیں گیا۔ اُسے اندر جانے میں کوئی خوف یا جھجک نہیں تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اِس گھر میں بے ضرر لوگ رہتے تھے۔ وہ گھر کے داخلی دروازے کے سامنے کار میں سے اُتری تو اُسے انتظار کرنے کا کہا گیا چناں چہ وہ انتظار کرنے لگی اور تھوڑی دیر کے بعد اُس کی پھوپھو کی عمر کی ایک خوب صورت عورت آئی جس کے ہونٹوں پر ایک پُرکشش مسکراہٹ چپکی ہوئی تھی۔ فردوس جان گئی کہ مسکراہٹ اصلی نہیں تھی۔ عورت نے اُسی طرح مسکراتے ہوئے اُسے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ فردوس جان گئی کہ اُس کے سامنے ایک تجربہ کار عورت کھڑی تھی۔ اُس کے ایسے دیکھنے سے وہ خوف زدہ بھی ہوئی۔ فردوس نے اُس عورت کو بتایا کہ وہ مشہد کی دوست تھی اور

اُسے ملنے آئی تھی۔عورت کے ہونٹوں سے چپکی ہوئی مسکراہٹ جاتی رہی اور باریک ہونٹ ایک گول دائرے میں تبدیل ہو گئے جہاں سے اُس نے ایک لمبی سانس نکالی۔فردوس کو عورت کی پریشانی کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی۔اب اُس کے اندر تجسس کے ساتھ ایک دلچسپی بھی پیدا ہوگئی تھی۔عورت کچھ دیر اُسے دیکھتی رہی اور پھر اُسے اشارہ کر کے اندر کی طرف چل پڑی۔فردوس کچھ جھجکی اور پھر اُسے خیال آیا کہ ڈرائیور اُس کے باپ کا خاص آدمی رہا تھا جو اُسے کسی بھی قسم کے خطرے میں سے نکال سکتا تھا۔فردوس نے ڈرائیور کی طرف دیکھا جس نے اُسے اندر جانے کا اشارہ کیا۔وہ ایک ایسے کمرے میں جا بیٹھے جس کی کھڑکی کے سامنے لان پھیلا ہوا تھا جو اُسے اصلی نہیں لگا۔عورت اب مسکرائی۔فردوس کو لگا کہ یہ مسکراہٹ اصلی تھی۔اُس مسکراہٹ میں حیرت کے ساتھ خوشی بھی تھی۔دونوں برابر بیٹھ گئیں۔عورت نے بتایا کہ وہ مشہد کی ماں تھی اور چند دِن پہلے مشہد کی ایک امیر آدمی کی خوب صورت بیٹی کے ساتھ شادی ہوگئی ہے اور وہ دونوں ہنی مون کے لیے یورپ گئے ہوئے تھے۔فردوس کو حیرت ہوئی کہ عورت کی آنکھوں میں آنسو تھے اور اُسے اُن آنسوؤں کی رڑک اپنی آنکھوں میں بھی محسوس ہوئی۔اُس نے سوچا کہ وہ کیوں رو رہی تھی؟ اُسے اپنے سامنے بیٹھی عورت پر ترس آ رہا تھا۔فردوس پوچھنا چاہتی تھی کہ مشہد اور اُس کی بیوی کے ساتھ کوئی خوب صورت آدمی بھی گیا تھا؟ اُسے خیال کا یہ کوندا آیا کہ یورپ کے کسی ملک میں مشہد شاید پیدل پھر رہا ہو یا پھر کسی چائے خانے میں سامنے دیکھتے ہوئے چائے کی گرم پیالی کے ٹھنڈے ہونے کا انتظار کر رہا ہو یا کسی بھیڑ والی جگہ پر کھڑا لوگوں کو دیکھ رہا ہو اور اُس کی بیوی کسی خوش شکل آدمی کے ساتھ کسی جادوئی کمرے میں جسمانی لذتیں کشید کر رہی ہو! کیا وہ بھی ایسے ہی کرتی؟ وہ اپنا سوال اپنے پاس ہی لیے اُٹھ کھڑی ہوئی۔

فردوس جب گھر پہنچی تو پھوپھو اُس کے انتظار میں تھی۔وہ جانتی تھی کہ ڈرائیور سے باقاعدہ پوچھ گچھ کی جائے گی۔اُسے پروا نہیں تھی کہ ڈرائیور کیا بتائے گا اور وہ یہ بھی جانتی تھی کہ ڈرائیور کچھ بھی نہیں بتائے گا۔اُس وقت فردوس نے پھوپھو کا مقابلہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔وہ ہار چکی تھی اور ہار کے بعد اُسے کوئی خوف نہیں رہا تھا۔مشہد اُس کے ساتھ ایسی شادی کرنا چاہتا تھا جہاں جسمانی آسودگی کے بغیر ہر آسودگی تھی۔اُس نے جسمانی آسودگی کو ترجیح دیتے ہوئے مشہد کی درخواست کو رد کر دیا تھا اس لیے اب اُس کے پاس جسمانی نا آسودگی کا کوئی جواز نہیں تھا۔وہ جسمانی آسودگی

کے لیے ہر وقت کوشاں رہے گی چاہے اُسے پھوپھو کا مقابلہ ہی کیوں نا کرنا پڑے۔ وہ گھر سے پھوپھو کے اُس اثر ورسوخ کو ختم کرنا چاہتی تھی جس کے وجود پانے کی وجہ اُس کی اپنی لاتعلقی تھی۔ اُس نے سوچا کہ وہ پھوپھو کو شکست دینے کے لیے کسی بھی حد تک جا سکتی تھی۔ اُس نے منشی کو پھوپھو سے چھیننے کا فیصلہ کرلیا۔ وہ اُس کا مقابلہ کیسے کرے؟ اُسے مردوں کو رجھانا نہیں آتا تھا لیکن پھوپھو کو مات دینے کے لیے اُسے منشی کو ورغلانا ہوگا۔ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ منشی کئی گھاٹوں کا پانی پیا ایک گھاگ آدمی تھا۔ اُس کا باپ بھی اُس کے خاندان کا منشی رہا تھا اور وہ سن رہی تھی کہ منشی اپنے بیٹے کی بھی منشی گیری میں تربیت کر رہا تھا۔

فردوس نے آتے جاتے منشی کو اپنی مسکراہٹ کی چکاچوند سے گھائل کرنا شروع کردیا۔ منشی کو پہلے تو سمجھ نہیں آئی اور پھر وہ جان گیا کہ فیروز خاں کی بیٹی اور بہن کو مرد کی ضرورت تھی۔ بہن نے ایک مرد پالیا تھا اور اب بیٹی کی باری تھی۔ اُس نے پھوپھو سے دوری اختیار کرنا شروع کردی۔ یہ رویہ فیروزہ کو پسند نہیں آیا اور وہ چڑچڑی سی رہنے لگی۔ منشی کبھی کبھار فردوس سے ہدایات اُس وقت لیتا جب فیروزہ سن رہی ہوتی۔ فردوس اُسے ہمیشہ یہی بتاتی کہ گھر کا انتظامی ڈھانچہ کمزور ہوتا جارہا ہے اور منشی کا فرض تھا کہ کبھی کوئی چیز کم نا ہو چناں چہ جنریٹر کے لیے ڈیزل ہر وقت موجود رہنے لگا اور اِسی طرح بجلی نا ہونے کی صورت میں سورج غروب ہونے کے بعد ہر طے کی گئی جگہ پر لالٹین روشن ہوتی۔ سب لوگوں کو گھر معمول پر آتے محسوس ہوا۔ لوگوں کے ایسا سوچنے کی سب سے زیادہ خوشی تو اُسے خود ہوئی تھی۔

پھوپھو ایک دِن کمرے سے باہر نہیں آئی۔ فردوس پریشان تو ہوئی لیکن اُس نے کوئی اہمیت نہیں دی۔ وہ جانتی کہ پھوپھو فیروزہ کب تک باہر نہیں آئے گی؟ شام کو وہ باہر آئی تو فردوس کو وہ تھکی تھکی اور پریشان لگی۔ اُس کی تھکاوٹ سے فردوس کو خوشی ہوئی۔ اُس نے سوچا کہ شام سے لے کے صبح ہونے سے کچھ دیر پہلے تک پھوپھو کمرے میں کیا کرتی تھی۔ اُس نے پھوپھو کی نگرانی کے لیے کسی کو مامور نہیں کیا تھا پھر بھی گھر میں کام کرنے والا ہر مرد یا عورت چغلی کھاتا رہتا جس کی اُس نے کبھی حوصلہ افزائی نہیں کی تھی۔ اب پھوپھو کم ہی دیکھی جاتی تھی اور گھر کے ہر معاملے پر فردوس مکمل طور پر حاوی تھی۔ تبھی یہ افواہ پھیل گئی کہ پھوپھو پیٹ سے تھی۔ جو عورتیں مخصوص دنوں میں پھوپھو کو روئی مہیا کیا کرتی تھیں اب کہتی پھر رہی تھیں کہ دو مہینوں سے پھوپھی کی ایسی کوئی

مانگ نہیں تھی۔ یہ کانا پھوسی فصیل نما دیواروں کے اندر تک ہی تھی۔ منشی ہر طرف پھیلی ہوئی پریشانی سے بے نیاز فردوس کے اردگرد منڈلاتا رہتا لیکن اُسے اپنا کھیل بگڑتے محسوس ہو رہا تھا۔ ایک دِن پھوپھو اپنے کمرے میں مردہ پائی گئی۔ فردوس نے اِس ہونی کو چھپانے کا حکم دیا اور فیروزہ کو رات کی تاریکی میں باعزت طریقے سے دفن کر دیا گیا۔ ساتھ کے دیہات کی مسجدوں میں دیگیں بھجوائی گئیں، قل کی ایک بڑی رسم کا اہتمام کیا گیا اور ہر جمعرات ایک قاری قبر پر تمام دِن تلاوت کرتا۔

فردوس اب گھر میں اکیلی تھی اور منشی مالک بننے کے خواب چھوڑ کے اپنی ملازمت بچانے کے چکر میں تھا۔ اُس دِن جب بجلی گئی تو جنریٹر کے لیے ڈیزل نہیں تھا۔ فردوس نے منشی کو بلایا اور ڈانٹنا شروع کر دیا۔ فردوس پہلے ہی ٹریکٹر کو ڈیزل لانے کے لیے بھیج چکی تھی اور منشی اُس کے سامنے خاموش کھڑا تھا۔ اُس نے لالٹینیں نہیں جلوائی تھیں کیوں کہ کھلی ہوئی چاندنی میں اُسے سب چمکتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ ٹریکٹر کے آنے کے لیے پھاٹک کھلا چھوڑا گیا تھا۔ فردوس منشی کو ڈانٹنے کے بعد چاند کی دودھیا کرنوں کے سحر میں گم تھی کہ اُسے ایک آواز سنائی دی۔ یہ ایک عجیب آواز تھی۔ کیا کسی کے پاؤں تلے کوئی خشک پتا آیا تھا؟ کیا کسی نے ایک طویل عرصہ ایک جگہ کھڑے رہنے کے بعد جب جسم کا وزن ایک پاؤں سے دوسرے پر منتقل کیا تو ہڈی کے چٹخنے کی آواز تھی؟ کیا کسی جانور نے ہڈی چبائی تھی؟ کیا کچھ بھی نہیں تھا اور صرف اُس کے کان ہی کچھ ایسا سُن رہے تھے جو وہاں نہیں تھا؟ اُسی وقت کسی کے ایک لمبی سانس لینے کی آواز آئی۔ فردوس نے ڈرتے ہوئے منشی کی طرف دیکھا کہ شاید وہ کچھ ایسا کرنا چاہتا تھا جس سے وہ اُس کی طرف مائل ہو جائے۔ منشی نے گھبراہٹ میں آواز کی طرف رُخ کر کے اپنی ٹارچ جلائی تو کچھ فاصلے پر ایک خستہ حال لڑکا کھڑا نظر آیا۔ منشی اُسے دیکھتے ہی ایک دم شیر ہو گیا اور فردوس پریشان ہو گئی۔ لڑکا خوف زدہ تھا اور اُس کی خستگی نے فردوس کے اندر ایک ہمدردانہ لہر کو وجود دیا۔ اِس کے باوجود وہ محتاط تھی۔ فردوس نے لڑکے کی طرف پھر دیکھا۔ فردوس کی نظر اب ٹارچ کی روشنی کی عادی ہو چکی تھی اور گہرے اندھیرے میں روشنی سے پیدا ہونے والی چکا چوند نہیں رہی تھی۔ اُسے لڑکے کے چہرے میں ایک سنجیدگی نظر آئی۔ وہ جو بھی تھا اُس کے کھڑے ہونے کے انداز میں اب کہیں بھی خوف کی پرچھائیاں تک نہیں تھیں۔ فردوس کو وہ ایک طرح سے پُر اعتماد لگا۔ منشی فوری طور پر پولیس کو اطلاع کرنا چاہتا تھا۔ فردوس جانتی تھی کہ منشی یہ سب اپنی اہمیت ثابت کرنے کے لیے کر

رہا تھا کیوں کہ تھوڑی دیر پہلے اُسے ڈیزل نا ہونے پر شرمندگی اُٹھانا پڑی تھی۔ اُسی وقت بجلی بھی آگئی اور گھر کا کونہ کونہ روشنی میں نہا گیا۔ لڑکے کے نقوش اور بھی واضح ہو گئے تھے۔ اُس کا ماتھا عمر کے لحاظ سے چوڑا تھا اور آنکھوں میں سے ذہانت ٹپکتی تھی۔ پچکے ہوئے گال اور آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے اُس کی خستگی کو ظاہر کرتے تھے۔ فردوس اِس نتیجے پر پہنچی کہ وہ کسی اچھے خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ لڑکے کے قرش میں سے بترتری ٹپکتی تھی اور یہی برتری اُسے اپنی عمر کے عام لڑکوں سے مختلف کرتی محسوس ہوتی تھی۔ فردوس نے منشی کو کہا کہ وہ ایک کرسی کا بندوبست کرے اور لڑکے کے لیے جگ میں میٹھا پانی منگوائے۔ وہ جان گئی تھی کہ لڑکا کمزوری سے نڈھال ہو رہا تھا اور اُسے طاقت کی ضرورت تھی۔ لڑکا خاموش بیٹھا اپنے سامنے دیکھتا رہا؛ مشہد کی طرح۔ فردوس کی چھاتی میں ہمیشہ کی طرح خلا بنا جسے اُس نے ایک لمبی سانس لے کے پُر کیا۔ لڑکے نے تین گلاس ایک ہی ایک میں پی کے فردوس کی طرف متشکرانہ نظر سے دیکھا، اُس کے ہونٹوں پر ایک خفیف مسکراہٹ تھی۔ فردوس نے لڑکے کے لیے کھانے کے لیے کچھ ہلکا سا منگوایا۔ اُسے پانی پیتے ہوئے دیکھ کے وہ اندازہ لگا چکی تھی کہ لڑکا کئی دنوں سے بھوکا تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ لڑکا ایک دم اتنا کھا لے کہ ہضم ہی نا کر سکے۔ لڑکا جب کھا چکا تو اُس کے ہونٹوں پر اطمینان میں ڈوبی ہوئی مسکراہٹ پھیل گئی۔ اب اُس کی آنکھوں میں نیند کا خمار تھا اور اُسے اپنی آنکھیں کھلی رکھنے کے لیے کوشش کرنا پڑ رہی تھی۔ فردوس نے منشی کو ہدایت دی کہ لڑکے کو گھر کے اندر والے مہمان خانے میں سلا دے۔ فردوس کو یہ فوری فیصلہ کرنا خاصا مشکل بھی لگا۔ منشی کو فردوس کا یہ التفات پسند نہیں آیا تھا لیکن اُسے فردوس کے مزاج سے واقفیت ہو چلی تھی اِس لیے اُس نے خاموشی کو ہی حل جانا۔ وہ جانتا تھا کہ صبح لڑکا جب گھر کی قیمتی چیزوں کے ساتھ کمرے میں نہیں ہوگا تو فردوس اپنی کوتاہ بینی سے خود ہی شرمندہ ہو گی۔ فردوس نے رات کو سونے سے پہلے مہمان خانے میں کھلنے والے تمام دروازوں کی اندر سے کنڈیاں لگا لیں۔ لڑکا اگلے دِن شام کو جاگا اور جب وہ باہر نکلا تو فردوس کو فوراً اطلاع کر دی گئی۔ منشی کو حیرانی تھی کہ گھر کے معاملات کے علاوہ ہر مسئلے سے لاتعلق رہنے والی فردوس اُس لڑکے میں اتنی دل چسپی کیوں لے رہی تھی؟ فردوس کو اُس لڑکے میں معصومیت کے ساتھ ایک کشش بھی محسوس ہوئی؛ ایسی کشش جو صرف اُن لوگوں کے لیے ہوتی ہے جن کے ساتھ گہری شناسائی ہو۔ کیا وہ اُس لڑکے کو کہیں دیکھ چکی تھی؟ اُسے اپنے اِس خیال پر ہنسی بھی آتی۔ وہ ایک معصوم لڑکا تھا اور

اُسے معصومیت پسند تھی۔شاید وہ خود بھی معصوم تھی اور اِسی لیے اُسے اپنی پھوپھی یا منشی کے لیے کوئی ہمدردی نہیں تھی۔اُس نے کسی کو کہہ کے لڑکے کو نہانے کے لیے بھیجا اور اُسے اپنے باپ کا ایک جوڑا دیا جو اُسے کافی کھلا تھا۔لڑکا جب اُس جوڑے میں آیا تو وہ کئی دنوں کے بعد کھلکھلا کے ہنس پڑی اور دیر تک ہنستی رہی۔لڑکا بھی اُسے ہنستے ہوئے دیکھتا رہا۔لڑکے کو کچھ کھانے کو دیا گیا۔ سونے،نہانے اور کھانے کے بعد لڑکے کی رنگت میں تبدیلی آ گئی تھی۔اُس کے گالوں میں اب تازگی تھی اور ہونٹوں سے ہلکا سا سرخ ڈھلکتا تھا۔فردوس ایک دم سنجیدہ ہوگئی اور اُس نے لڑکے کو اپنے سامنے بٹھالیا۔وہ کچھ دیر ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔

''تمھارا نام کیا ہے؟''فردوس کے لہجے میں اب سختی تھی۔لڑکا تھوڑا خائف بھی ہوا۔اُسے یقین ہی نا آیا کہ اتنی ہمدردی جتانے والی عورت ایسے سرد لہجے میں بھی بات کرسکتی ہے۔اُس نے اپنے آپ پر قابو پایا اور آواز میں لرزش کے آنے کو روکا۔

''اعجاز!''لڑکے کو فوراً یہ نام اپنے منہ سے نکلتا سنائی دیا۔

''یہاں کیا کر رہے ہو؟''فردوس کے لہجے میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔اُس نے دیکھا کہ منشی دور کھڑا ہوا اُسے دیکھ رہا تھا اور وہ یہ جانتی تھی کہ وہ چاہتا تھا کہ اُسے بلا لیا جائے۔

''بھاگ کر آیا ہوں۔''اب اعجاز پُراعتماد ہو گیا تھا۔

''کیوں؟''

''تا کہ مارا نا جاؤں۔''فردوس اور اعجاز ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھ رہے تھے۔ دونوں ہی ایک دوسرے کو تول رہے تھے۔اعجاز اُس کے اگلے سوال کے بارے میں سوچ رہا تھا اور فردوس اُسے مار دیے جانے کی وجہ جاننا چاہتی تھی۔

''کون مارنا چاہتا ہے یا تھا؟''

اعجاز کو اِس سوال کے پوچھے جانے کا اندازہ تھا لیکن اُس نے کوئی جواب تیار نہیں کیا تھا۔ وہ چھید کر دینے والی لیکن خالی نظروں سے فردوس کو دیکھتا رہا۔پھر اُس نے ایک لمحے کے لیے نیچے دیکھا۔''میرے گھر والے۔''

''کیوں؟''

''تا کہ میری جائداد پر قبضہ کرلیں۔''فردوس کو پھر اپنی جائداد کا خیال آگیا۔اگر وہ مرگئی

ہوتی تو؟ اُس نے سوچا کہ اُس نے مرنا نہیں تھا اِسی لیے وہ زندہ تھی۔

''تمھارا باپ؟'' فردوس کو اپنے لہجے میں سوال کے بجائے الزام لگا۔

''نہیں ہے۔'' اعجاز نے ایک لمبی سانس کھینچتے ہوئے کہا۔ فردوس کو اعجاز بھی اپنی طرح لگا۔ باپ نہیں ہے اور خاندان والے اُسے ختم کر کے جائداد پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔

''وہ کیا کرتا..... کرتے تھے؟'' فردوس متواتر سوچے جا رہی تھی۔ اب اُس کے لہجے میں سردمہری کے بجائے پریشانی تھی۔ اعجاز پہلی بار اُسے پُراعتماد نہیں لگا۔

''وہ انقلابی تھا۔'' اعجاز نے تیزی کے ساتھ کہا۔ فردوس نے ایک لمحے کے لیے اُسے خالی نظروں سے دیکھا اور پھر قہقہہ لگا کے ہنس پڑی۔ وہ اتنا ہنسی کہ اُس کی آنکھیں پانی سے بھر گئیں۔

''انقلابی کیوں تھا؟'' فردوس کی آواز میں ابھی تک ہنسی کی کھنک تھی۔

''اِس لیے کہ دنیا میں سب انسان برابر ہو جائیں۔''

''کامیابی ہوئی اُسے؟'' اب فردوس سنجیدہ ہوئی۔

''شاید ہو بھی جاتی لیکن اُسے مروا دیا گیا۔ لوگ ابھی تک اُسے یاد کرتے ہیں۔'' اعجاز نے سوچتے ہوئے جواب دیا۔

''تم بھی انقلابی ہو؟''

''جی ہاں۔ ہوں۔'' اب فردوس مسکرا رہی تھی۔ اُس کی مسکراہٹ میں دلچسپی تھی۔

''یہاں انقلاب لانے آئے ہو؟'' وہ مسکرائے جا رہی تھی۔

''نہیں جی۔ اپنی جان بچانے۔'' اُسے پہلی بات پر قائم رہنا ہی اپنی بچت لگا۔

''انقلاب کیسے لاؤ گے؟'' فردوس اب آنکھ مچولی کھیلنے پر اُتر آئی تھی۔

''دولت اکٹھی کرنے کے بعد۔'' فردوس کا رنگ ایک دم زرد ہو گیا اور پھر اُس نے اپنے آپ پر قابو پا لیا۔ اُسے اپنے سامنے بیٹھا ہوا بے بس لڑکا اپنا دشمن لگا اور اُسے اُس کی صاف گوئی کی وجہ سے اُس کے ساتھ ہمدردی بھی تھی۔ وہ اُٹھ کر ٹہلنے لگی۔ اُس نے لڑکے کے ساتھ اتنی باتیں کیوں کیں؟ وہ تو اُس کی جائداد اُس کے ملازموں میں بانٹ کے اُسے اُن کی طرح کر دینا چاہتا ہے۔ کیا ایسا ممکن ہے؟ اُس نے اعجاز کی طرف دیکھا۔ وہ، اُس سے بے نیاز، کرسی پر آرام سے بیٹھا تھا۔ فردوس کو اُس کے چہرے پر کوئی پریشانی یا اُلجھن دکھائی نہیں دیں۔ فردوس نے پھر ٹہلنا

شروع کر دیا۔ اُس نے اعجاز کے باپ کا نام نہیں پوچھا تھا اور نا ہی اُس کے گھر کا پتا۔ اگر اُس نے اعجاز کو اپنے پاس رکھا تو وہ یہاں ایک انقلابی تحریک کا آغاز کر سکتا ہے۔ لیکن انقلاب لانے سے پہلے اُس نے دولت اکٹھی کرنی ہے۔ وہ دولت کیسے اکٹھی کرے گا؟

''تم دولت کیسے اکٹھی کرو گے؟''

''محنت کر کے۔'' اعجاز کے جواب کی سادگی نے فردوس کو خاموش کرا دیا۔ وہ کچھ دیر اُسے دیکھتی رہی۔

''کیسی محنت کرو گے؟'' اب فردوس متجسس تھی۔

''جو بھی کام کرنے کو مل جائے۔'' فردوس کو اِس جواب نے کچھ حوصلہ دیا۔ اُسے اعجاز اب شناسا سا لگنے لگا۔ اُس نے زندگی میں کام کرنے کا شوق رکھنے والا پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اُس کا باپ لوگوں کے کام پر زندگی گزارتا تھا اور وہ خود بھی اپنے باپ کے طریقہء کار پر چل رہی تھی۔ اُس کی پھوپھی کو تو شاید اتنی بھی دل چسپی نہیں تھی اِسی لیے وہ جسمانی آسودگی کی تکمیل میں اپنی جان دے بیٹھی۔ منشی ایک بدنیت انسان تھا جس کی محنت میں خلوص نہیں تھا اور اُن کے کارندے اُنھیں صرف خوش رکھنا چاہتے تھے تاکہ وہ ایک کو دوسرے سے زیادہ دیں۔ اُس نے اچانک اپنے آپ کو اعجاز کا ہم خیال بنتے محسوس کیا۔ ''تم کچھ اور سو لو، صبح بات کریں گے۔'' اعجاز کچھ کہے بغیر مہمان خانے کی طرف چلا گیا اور وہ اُسی طرح ٹہلتی رہی۔ اُس نے سوچا کہ وہ اِس غیر اہم قسم کے لڑکے کو اتنی اہمیت کیوں دے رہی تھی؟ ایسے تو نہیں کہ لڑکے میں کچھ ایسی کشش ہے جو اُسے پتا چلے بغیر اُسے اُس کی طرف مائل کر رہی تھی؟ وہ ٹہلتے ہوئے رُک گئی۔ اُس کی عمر تیس برس ہے اور لڑکا کسی بھی طرح اٹھارہ سالوں سے زیادہ کا نہیں۔ اُس کے ہونٹوں پر مونچھوں کی ہلکی سی لکیر ہے جو ابھی سیاہ نہیں ہوئی، اُس کے گالوں پر ہلکے ہلکے بال اُگ رہے جب کہ ٹھوڑی پر داڑھی کا ہلکا سا احساس ہوتا ہے۔ وہ عمر میں اُس سے کم از کم بارہ سال چھوٹا تھا۔ اُسے اپنے آپ پر غصہ بھی آیا اور کسی حد تک نفرت بھی ہوئی جو وہ ایسی اخلاق سے گری ہوئی باتیں سوچ رہی تھی۔ پھر وہ مشہد کے گھر کیوں گئی تھی؟ اگر اُس میں کوئی جسمانی محرومی نا ہوتی تو کیا وہ اُس کے ساتھ جنسی رشتہ قائم کرنے سے گھبراتی؟ لیکن مشہد تو اُس کی حیثیت کا آدمی تھا اور پھوپھو فیروزہ نے ایک کم تر آدمی سے حمل ٹھہرا کے اپنے مقام کو کم تر کر دیا۔ وہ ایسے کسی رشتے میں ملوث نہیں ہونا چاہتی جو اُس کے مقام کو

کم کردے۔ وہ اپنے سے کم عمر لڑکے کے ساتھ ،جس کا خاندان انقلاب میں یقین رکھتا ہے،اور جس کی حیثیت کے بارے میں اُسے کچھ بھی معلوم نہیں،خود کو کیسے ملوث کر سکتی تھی؟ پھر وہ اُس کے متعلق سوچ کیوں رہی تھی؟ ایسے تو نہیں کہ وہ اُسے سچ مچ پسند آ گیا ہو اور اب وہ اپنے آپ کو اُس تعلق کی چھاننی میں سے چھنے جانے سے بچنے کے لیے بے بنیاد تاویلیں گھڑ رہی ہو؟ اُس لڑکے میں کچھ ایسا تھا جو اُسے اپنے ذہن میں آباد کسی خاکے کو چھو جاتا تھا۔ایسا ہی اُس نے مشہد کو پہلی بار دیکھ کے محسوس کیا تھا۔کیا یہ لڑکا مشہد ہی کی توسیع تھا؟ وہ پریشان ہو گئی اور اُس نے ٹہلنا بند کر دیا۔وہ کچھ دیر وہاں بے جان سی کھڑی رہی۔اگر یہ لڑکا مشہد کی توسیع تھا تو کیا کوئی اور اِس لڑکے کی توسیع ہو گا؟ وہ خوف زدہ ہو گئی۔کیا ایسا ہر عورت کے ساتھ ہوتا ہے یا وہ اکیلی ہی تھی جو اِس سلسلے میں سے گزر رہی تھی؟ کیا یہ کوئی محرومی تھی یا کوئی تجسس جو اُسے تجربات میں سے گزارنا چاہتا تھا؟ اُس نے سامنے دیکھا تو منشی اُسے دیکھ رہا تھا۔اُسے منشی کا وہاں کھڑا ہونا عجیب سا لگا اور غصہ بھی آیا۔وہ وہاں ایسے کھڑا تھا جیسے صرف اُسے ہی دیکھنا چاہتا ہو۔اُس کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں تھا۔وہ وہاں ایک ملازم کی حیثیت میں کھڑا تھا جیسے اُس کے کسی اشارے کا منتظر ہو۔ کیا اُسے ایسے کسی اشارے کا انتظار تھا جو شاید اُسے پھوپھو فیروزہ نے کیا تھا؟ اُسے اچانک خود سے گھن آنے لگی۔کیا منشی بھی اُسی خاکے کا حصہ تھا؟ وہ یقیناً کسی کی توسیع نہیں تھا اور نا ہی کوئی اُس کی توسیع ہو گا۔وہ جانتی تھی کہ منشی اُن کے تمام مالی اور انتظامی معاملات سے آگاہی رکھتا تھا اور یہی وہ دباؤ تھا جو وہ ہر وقت اُس پر ڈالنے کی کوشش کرتا۔جہاں پھوپھو فیروزہ اُسے کالج میں پڑھانے کے حق میں تھی،منشی اُسے کم تعلیم یافتہ ہی رکھوانا چاہتا تھا اور اُس کی اِس سوچ کی وجہ منشی کا اپنا مستقبل تھا۔وہ تعلیم حاصل کرنے کے بعد منشی کے کھاتوں اور دیگر اخراجات کی پڑتال کر سکتی تھی۔پھر بعد میں شاید پھوپھو کی سوچ پر منشی کی سازش غالب آ گئی ہو اور اُس نے یہ اعلان کروا دیا ہو کہ فردوس کی شادی نہیں کی جائے گی۔

فردوس نے پھر ٹہلنا شروع کر دیا۔وہ لڑکے کو اپنے پاس رکھنے کا فیصلہ کر چکی تھی۔وہ اُسے اپنے پاس کیوں رکھنا چاہتی تھی؟ کیا اُسے اُس کی ضرورت تھی؟ اُسے قطعاً اُس کی ضرورت نہیں تھی۔پھوپھی کے فوت ہونے کے بعد اُس نے تمام معاملات اپنے قبضے میں کر لیے تھے؛ منشی اب صرف احکام بجا لاتا۔منشی اُس کا کل وقتی ملازم تو تھا لیکن اُسے منشی پر اعتبار نہیں تھا۔اُسے کسی ایسے

فرد کی ضرورت تھی جس پر وہ اعتبار کر سکے اور جسے وہ لالچ نا ہوں جو منشی کی زندگی کا حصہ تھے۔ گھر کی چار دیواری کے اندر افواہ تھی کہ منشی نے شہر میں ایک کنال کا پلاٹ خرید لیا ہے جس پر وہ جلد ہی گھر کی تعمیر شروع کرنے والا تھا۔ فردوس نے طے کر لیا کہ وہ اُس کا گھر تعمیر نہیں ہونے دے گی۔ وہ اُسے کیسے روکے گی؟ وہ ٹہلتے ہوئے پھر رُک گئی۔ اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ وہ لڑکے کو کیے جانے والے سوالات کا سلسلہ بند کر دے گی۔ اُس کے ذہن میں ایک دم یہ کوندا لہرا گیا کہ وہ کہیں اِس تفتیش سے گھبرا کے بھاگ ہی نا جائے! اُس نے کسی دِن منشی کو اُس کی ذمے داریوں سے فارغ کر دینا ہے اور منشی نے اُسے ایسا کرنے سے روکنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگانا ہے۔ وہ جانتی تھی کہ وہ خاندان کے خساروں کی بات کرے گا، اپنی پرانی وابستگی کا واسطہ دے گا جو تین نسلوں سے اُس کے خاندان کے ساتھ تھی، وہ اپنی کوتاہیوں کی معافی مانگتے ہوئے آئندہ محتاط رہنے کی یقین دہانی کرائے گا اور جب کچھ نا بن سکا تو پھوپھو کی خودکشی کے راز کو فاش کرنے کی دھمکی دے گا۔ وہ ہر ممکنہ امکان کے لیے تیار تھی اور اگر اُس کی شادی نہیں ہوئی تو اُس نے اپنے خاندان کو اُسی مقام پر لانا ہے جہاں اُس کے باپ کے دنوں میں تھا۔ اُس نے منشی کو فارغ کر کے کسی ایسے فرد کو یہ ذمے داری سونپنا تھی جو منشی کی طرح لالچ سے بھرا ہوا نا ہو۔ اُس کا باپ کہا کرتا تھا کہ ہر کارندہ معمولی سی بے ایمانی ضرور کرتا ہے جسے روکنا ممکن نہیں لیکن اُسے اُتنے سے آگے بڑھنے کی گنجائش دینا مالک کی نالائقی ہوتی ہے۔ اُس نے سوچا کہ ایمان داری مالک کی گنجائش کے ساتھ وابستہ ہونے کے علاوہ کارندے کی ذات کے ساتھ بھی منسلک ہے۔ بے ایمان آدمی ہمیشہ بے ایمان ہی ہوگا اور ایمان دار، بے ایمانی کرنے کا سوچنے کے باوجود بے ایمانی نہیں کر سکتا۔ وہ لڑکے کی ایسے تربیت کرے گی کہ وہ منشی کی جگہ سنبھال سکے۔ کیا وہ ایسا اُسے اپنے نزدیک رکھنے کے لیے تو نہیں کر رہی؟ اُس نے سوچا کہ اگر وہ اُسے اپنے نزدیک رکھنا چاہتی ہے تو اُسے کون روک سکتا ہے۔ اِس خیال کے آتے ہی اُس نے اپنے آپ کو طاقت ور محسوس کیا۔ وہ ایک وسیع جائداد کی واحد مالک تھی اور اُس نے اپنے فیصلے خود ہی کرنے تھے جن میں فی الوقت سب سے اہم فیصلہ لڑکے کو روکنا تھا۔ اُس نے فیصلہ کیا کہ وہ انقلابی کو قائل کرے گی!

.....اعجاز جب مہمان خانے میں گیا تو اُسے اپنے اردگرد پریشانیوں اور اُلجھنوں کا ایک اِزدِحام محسوس ہوا اور وہ اُس بھیڑ میں ایک بے جان وجود کی طرح تھا۔ اُسے اپنے آپ کو شناخت کرنے میں دشواری پیش آ رہی تھی۔ وہ جس مہمان خانے میں تھا اُتنا آرام دہ کمرہ اُس نے پہلے کبھی دیکھا ہی نہیں تھا۔ اُسے اپنا گھر یاد آ گیا۔ باورچی خانہ جو پہلے کھلے آسمان کے نیچے ہوا کرتا تھا پھر اُس پر ایک چھت ڈل گئی جو ڈھکا ہونے کے باوجود کھلے میں ہی تھا۔ وہ نا تو بارش کی بوچھار روک سکتا تھا اور نا ہی تیز ہواؤں کو۔ وہ جس کمرے میں تھا اُس کے ساتھ ایک غسل خانہ تھا جس میں دو قسم کے صابن تھے اور دونوں کی خوشبو ایک دوسرے سے مختلف تھی۔ اُسے یاد نہیں کہ یہاں پہنچنے سے پہلے وہ کتنے دِن چلتا رہا تھا، اُس کے جسم سے کتنا پسینہ بہا تھا، اُس نے کتنے دِن بھوک اور پیاس کی شدت برداشت کی تھی اور وہ کس ذہنی پریشانی اور دباؤ میں سے گزرا تھا۔ کمرے کے درمیان میں ایک چوڑا پلنگ تھا جس کے اوپر ایک آرام دہ گدا تھا اور گدے کے اوپر پھولوں والی چادر اور چادر کے رنگ کے ہی دو تکیے: ایک نرم اور دوسرا تھوڑا سا سخت۔ ایسا کمرہ ڈیرے والوں کے گھر میں تھا اور نا ہی اُن کے ڈیرے میں۔ کمرے کی ایک دیوار میں آدھی دیوار جتنا آئینہ تھا جس کے ساتھ لگی پٹی پر کنگھا اور چند خوشبوئیں پڑی تھیں۔ وہ خوب نہایا تھا اور خوشبو دار صابن کو رگڑ رگڑ کے بدن پر ایک عرصے سے جمی میل اور پسینے اور اچھی طرح سے نا نہانے کی بوُ اتارتا رہا تھا۔ وہ اتنا نہایا تھا کہ نہانے کے دوران اُسے اپنی تھکن بھی اُترتے ہوئے محسوس ہوئی تھی اور فوارے کے نیچے کھڑے اُس پر نیند کا غلبہ طاری ہونا شروع ہو گیا تھا۔ آئینے کے سامنے کھڑے ہو کے اُس نے نیند سے بھری اپنی آنکھوں کو دیکھا تھا اور اُسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ واپس گھورتی شکل اُسی کی تھی یا کوئی اور اُسے دیکھ رہا تھا۔ اُس نے سفید کرتا اور کئی گز کا تہہ بند باندھا ہوا تھا۔ ایسا لباس تو صاحبِ حیثیت لوگ پہنتے ہیں؛ ڈیرے والے دونوں بھائی ہر روز ایسا لباس پہنتے تھے۔ وہ آئینے میں دیکھتا جاتا تھا۔ سفید رنگ کے کھلے کرتے اور تہہ بند میں اُس کی شکل کس کے ساتھ ملتی تھی؟ اُس نے اپنے

باپ کو نہیں تھا اِس لیے وہ کہہ نہیں سکتا تھا کہ اُس کی شکل باپ جیسی تھی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ کوئی اُسے کہے کہ وہ اپنے باپ جیسا نہیں ہے۔ اُس نے اپنی ماں کی مشابہت تلاش کرنے کی کوشش کی لیکن اُسے ماں سے مشابہ کوئی بھی نقش نظر نہیں آیا۔ ڈیرے والے اُس کے باپ کے رشتے دار تھے۔ اُس کا باپ ایک دبلا آدمی تھا جس کے متعلق کہا جاتا تھا کہ اُس کے بھاری نا ہونے کی وجہ وہ جدوجہد تھی جسے اُس نے اپنی زندگی کا مقصد بنایا ہوا تھا۔ ڈیرے والے دونوں بھائیوں کے مشابہ نقوش کو اگر الگ کر کے باقیوں کو یکجا کیا جائے تو اُس کا باپ وہاں نظر آتا تھا؛ فرق صرف وزن میں تھا۔ وہ ڈیرے والے دونوں بھائیوں کی شکلیں ذہن میں لا کے اُنھیں اپنے چہرے میں ڈھونڈتا رہا لیکن وہ دونوں ہی کسی طرح بھی وہاں موجود نہیں تھے۔ کیا اُس کی شکل اپنی ہی تھی یا نام کی تبدیلی کے ساتھ اُس کی شکل بھی نئی ہو گئی تھی؟ کل اگر وہ گھر کی مالکن کو اپنا اصلی نام بتا دے تو وہ کیا وہ فیاض بن جائے گا؟ اُسے کیا بننا چاہیے؟ اعجاز یا فیاض؟ فیاض ایک ایسا لڑکا تھا جس کے مقدر میں اوپر والے نے صبح شام کی محنت لکھ دی تھی۔ اُسے محسوس ہو رہا تھا کہ اعجاز کو شاید اُس طرح کی محنت نا کرنی پڑے۔ وہ ایسا کیوں سوچ رہا تھا؟ اعجاز کو وجود پائے ابھی دو دِن بھی نہیں ہوئے تھے اور وہ اُس کے حق میں سوچنا شروع کر چکا تھا جب کہ فیاض نے اُسے وہ سب سکھایا تھا جس کی ترتیب سے وہ اب سوچ رہا تھا۔ اگر وہ فیاض بن جائے تو شاید اُسے گھر میں قبول ہی نا کیا جائے۔ اُس کے اندر کا فیاض اُسے بتا رہا تھا کہ فیاض اگر مر گیا تو وہ بھی زندہ نہیں بچے گا لیکن اِس کے ساتھ اعجاز کا موجود رہنا بھی ضروری تھا۔ اُسے اِس گھر میں لے کے آنے والا تو فیاض تھا لیکن اب فیاض کو کہیں جانا نہیں تھا۔ وہ جہاں بھی جائے گا، وہ فیاض کو اپنے سے الگ کرنے میں کبھی کامیاب نہیں ہوگا۔ اُس کی بقا کے لیے ضروری تھا کہ فیاض کی ہستی کو اپنی ذات کے کسی کونے میں گوشہ نشین کر دے اور جب بھی اُس کی ضرورت پیش آئے، اُسے ظاہر کر دے: اُس کے لیے وہ مخفی بھی رہے اور عیاں بھی۔ لیکن وہ اعجاز کا کیا کرے؟ اعجاز اب وجود پا چکا تھا اور اُسے زندہ رکھنا ہی اُس کی بقا تھی اِس لیے اُسے فیاض کو پس پشت رکھنا ہی ہوگا۔ اُس کی شکل اپنی ماں سے نہیں ملتی تھی اور نا ہی باپ سے اور نا ہی باپ کے قریب ترین رشتے داروں کے ساتھ۔ وہ حیرانگی میں گم اپنے آپ کو دیکھتا تھا اور سوچتا تھا کہ کیا وہ اپنے مقصد کو پا سکے گا؟ اُس کا مقصد کیا تھا؟ مالی طور پر اتنا خوش حال ہو جانا کہ ڈیرے والوں کو مکمل طور پر شکست دے۔ یہ کون کرے گا؟ فیاض یا اعجاز؟ وہ آئینے کے

سامنے سے ہٹ کے مسہری پر لیٹ گیا۔ گدّے کی نرماہٹ نے اُسے خوش آمدید کہا۔ اُسے اپنی آنکھیں بھاری لگیں۔ اُس نے سوچا کہ کیا نیند ہمیشہ ایسے ہی کرتی ہے؟ فیاض ٹرک میں سفر کرتے ہوئے سوتا کم تھا؛ صرف ایک اونگھ سی کبھی کبھار آجاتی۔ اُسے تب نیند آتی جب وہ کسی جگہ سونے کے لیے رکتے۔ فیاض اُن لوگوں کو پسند نہیں کرتا تھا جن کے نزدیک نیند زندگی کا سب سے اہم حصہ تھا۔ وہ چھت پر لیٹے تب بھی جاگ رہا ہوتا تھا جب ماں فجر کی نماز کے لیے اُٹھتی اور ایک نظر اُس پر ڈالتی۔ فیاض کو اُس کا ایسے دیکھنا کبھی ناگوار بھی گزرتا۔ وہ سوچتا کہ ماں اُسے ہمیشہ سے بچہ ہی سمجھتی آئی تھی۔ اُسے خیال آیا کہ ماں کو پیسوں کی بھی ضرورت ہو سکتی تھی۔ اُسے جلد ہی کچھ بندوبست کرنا ہوگا تاکہ ماں کو پیسے بھیجے جانے کا سلسلہ چلتا رہے۔

وہ آنکھیں بند کر کے خالی الذہن لیٹا رہا۔ اُس کے ذہن میں اچانک ایک کشمکش جاری ہوگئی۔ وہ اپنے آپ کو ایک مستقل ہستی بنانا چاہتا تھا۔ دو حصوں میں بٹا ہونے کی وجہ سے وہ خود کو ناکامی کی طرف گامزن محسوس کرتا اور ایسی راہ پر چلتے ہوئے وہ خود کو بھی کھو بیٹھے گا اور یہ تقسیم اُس کے اندر کبھی اعتماد نہیں آنے دے گی۔

اُس نے اعجاز کو زندگی دینے کا فیصلہ کر لیا۔

اعجاز نے سوچا کہ وہ جس گھر میں آیا ہے وہ بھی ایک نئے وجود کا متلاشی تھا؛ بالکل اُس کی طرح۔ گھر کی مالکن اُسے جن نظروں سے دیکھتی تھی وہ اُنھیں سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ اُن نظروں میں اُسے اپنایت کے ساتھ بیگانگی بھی نظر آتی۔ اُسے محسوس ہو رہا تھا کہ گھر کے نظام پر کوئی اور قابو تھا لیکن وہ مکمل طور پر قابض ہونا چاہتی تھی۔ اُس کی شکل اچھی تھی؛ چہرہ تھکاوٹ کے گہرے آثار کے باوجود ایک تازگی لیے ہوئے تھا۔ اُسے چہرے میں ایک کشش محسوس ہوتی۔ وہ اُس کی طرف مسلسل دیکھے جانا چاہتا تھا تاکہ اُس کے تاثرات سے اُس کے باطن میں جھانک سکے لیکن اُس کا چہرہ سورج کے سامنے سے گزرتی چھوٹی چھوٹی بدلیوں کی طرح کا تھا جن کی وجہ سے زمین پر دھوپ ہوتی اور اگلے ہی لمحے سایہ۔ وہ اُسے جاننا چاہتی تھی۔ وہ اُسے کیوں جاننا چاہتی تھی؟ کیا اُسے کسی انجانے کی مدد کی ضرورت تھی؟ وہ اپنے قریب والوں پر شاید اعتماد نہیں کرتی تھی۔ وہ اپنا آپ اُس سے کیوں چھپا رہا تھا؟ شاید وہ اپنے آپ سے خوف زدہ تھا۔ اُس نے اِس خوف کو ختم کرنے کا سوچا۔ وہ ایک امیر خاندان کے گھر میں پناہ لے چکا تھا۔ اُس خاندان نے اُسے فراخ

دلی سے قبول کرتے ہوئے ایسی عزت کے قابل سمجھا اور اُسے اتنا آرام دہ کمرہ دیا جو وہ شاید پوری زندگی نہ دیکھ سکتا۔ اب اُس کمرے میں اُس کی یہ دوسری رات تھی۔ وہ جب آیا تو اُس کی حالت گھر کے ملازموں سے بھی ابتر تھی اور اُسے کسی کڑھ یا خالی کھرلی میں جگہ ملنی چاہیے تھی۔ کیا وہ عورت اُسے اپنے کسی استعمال میں لانا چاہتی تھی یا اُس کے نصیب میں ایسا کچھ لکھ دیا گیا تھا کہ وہ ایک کے بعد دوسرے امتحان میں سے گزرتا رہے؟ اِس خیال سے اُس کے ہونٹوں پر ایک تھکی ہوئی مسکراہٹ پھیل گئی۔

اعجاز عورت کی شخصیت کی گانٹھیں نہیں کھول پایا تھا۔ وہ ایک سمجھ جانے اور نا سمجھ پانے کی کیفیت میں تھا۔ اُسے گھر کے ماحول میں ایک پُر اسراری ٹھنڈک محسوس ہوئی۔ ڈیرے والے بھی علاقے کے بڑے زمین دار تھے لیکن اُن کے ہاں وہ خلوص نہیں تھا جو اُسے یہاں نظر آیا۔ کیا یہ لوگ باقیوں سے مختلف تھے یا ڈیرے والے؟ یہاں ایک پڑھی لکھی ہوئی عورت اُسے ملی جس کی سوچ مردوں والی تھی۔ اگر اُس کی سوچ میں وہ جارحیت نا ہوتی تو اُسے اب تک چلتا کیا ہوتا۔ وہ سڑکوں پر آوارہ پھرتے کسی اعجاز کی عمر کے لڑکے کی طرح تھا لیکن اُس عورت میں اتنی سمجھ تھی کہ اُس نے اُسے گھر میں ٹھہرنے کو کہا۔ گھر میں ٹھہرانا دراصل ایک طرح سے اعتماد کی نشانی تھا۔

وہ ایک دم چونک کے اُٹھ بیٹھا۔ وہ ڈیرے والوں کے متعلق کیوں سوچ رہا تھا اور اُس کا اِس گھر کے ساتھ اُن کا موازنہ کروانا غیر دانش مندانہ تھا۔ وہ فیاض کو اپنے اندر کے قبرستان میں دفن کر چکا تھا اِس لیے فیاض کے ساتھ وابستہ ہر یاد یا واقعہ اپنی حقیقت کھو چکا تھا۔ اُسے فیاض کو بھول جانا چاہیے اور اگر وہ کسی انجانے دیار کا دروازہ کھٹکھٹائے تو اُسے بہرہ بن جانا چاہیے۔

یہ سب سوچتے ہوئے اعجاز کو نیند آ گئی۔

اعجاز کی جب آنکھ کھلی تو اُس نے خود کو تازہ دم محسوس کیا۔ اُسے لگا کہ وہ زندگی میں پہلی مرتبہ جاگا تھا اور نیند ہی اُس کی زیست کا حاصل رہی تھی۔ سورج کی روشنی بھاری پردوں کے باوجود اپنی موجودگی کا احساس دلا رہی تھی۔ وہ جب کھڑا ہوا تو کسی قسم کی تھکاوٹ کا احساس تھا۔ وہ غسل خانے میں گیا اور نہا کے کمرے میں لگے آئینے کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اُس کے سر کے بال بے ترتیب اور بڑے تھے۔ اُسے سامنے واپس جھانکتا ہوا لڑکا اپنا ہم شکل لگا اور اطمینان بھی ہوا کہ وہ لڑکا اچھی شکل کا مالک تھا۔ کنگھے کے ساتھ اپنے بال درست کر کے جب وہ باہر نکلا تو سورج کی

نی اُس کی توقع سے زیادہ تیز تھی اور اُس کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ تین یا چار بار تیزی کے ساتھ
ہیں جھپکنے کے بعد وہ صحیح طرح دیکھنے کا اہل ہوا تو اُسے وہ عورت نظر آئی۔ وہ اُسی جگہ بیٹھی تھی
ہاں گزری ہوئی شام کو بیٹھی ہوئی تھی؛ اُس نے وہ لباس زیب تن نہیں کیا تھا جو وہ پچھلی شام کو
ہنے ہوئے تھی۔ اُسے دیکھ کے وہ مسکرائی۔ اُس کی مسکراہٹ اعجاز کو روشن دِن کا حصہ لگی۔ وہ تھوڑا سا
جھکا۔ اُس کے اندر کا اعجاز ایک لمحے کے لیے ڈانواڈول ہوا۔ اُس نے سوچا کہ وہ اپنے پرانے
پڑے پہنے اور یہاں سے بھاگ جائے۔ اگلے ہی لمحے اُس کے اندر کے اعجاز نے اُس کے
ہن کے کسی بیدار گوشے سے طاقت حاصل کر لی۔ وہ اُس کی مسکراہٹ کے جواب میں مسکرایا۔
ورت نے اُسے آنکھ سے سامنے والی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ یہ وہی کرسی تھی جس پر گزری ہوئی
شام کو بیٹھا رہا تھا۔ وہ اُس کرسی کی طرف چل پڑا تو اُسے اپنی چال میں ایک تبدیلی محسوس ہوئی۔
اُسے لگا کہ چھاتی تان کے چل رہا ہے اور اُس کی نظر سامنے اور عورت کے پیچھے کچھ دیکھ رہی
ہے۔ اُس کی چال ایسی تو بالکل نہیں تھی۔ وہ تھوڑا آگے کو جھک کے، زمین کی طرف دیکھتے ہوئے
چلتا رہا تھا۔ اِس چال میں اُسے ہمیشہ عاجزی اور ایک خوف محسوس ہوا کرتے تھے۔ اب جب وہ
اُس مسکراتی ہوئی عورت کی طرف چھوٹے چھوٹے قدم اُٹھاتے ہوئے چل رہا تھا تو اُسے اپنے
اندر ایک تکبر کا احساس ہوا۔ وہ طاقت ور تھا اور اُس کی طاقت اُس کے اپنے اندر تھی۔ وہ تو وہاں
شروع سے ہی موجود تھی، وہ اُس مخفی طاقت سے اتنا خائف تھا کہ اُس نے اُسے اپنے اندر سانس
لیتے ہوئے محسوس کرنے کی کبھی کوشش ہی نہیں کی تھی۔ اعجاز نے دیکھا کہ اب وہ عورت مسکرا نہیں
رہی تھی۔ اُس کے چہرے پر بے بسی تھی اور وہ اُسے غور سے دیکھ رہی تھی جیسے اُس نے اُسے پہلے
کبھی دیکھا ہی نہیں تھا۔ اعجاز سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا اور بیٹھتے ہوئے اُس نے اپنے تہہ بند کو
سنبھالا کہ کسی طرح سے بے پردگی نا ہو۔ اب وہ عورت اپنی بے بسی پر قابو پا چکی تھی اور اُس کے
ہونٹوں پر پہلے والی دمکتی ہوئی مسکراہٹ کا عکس تھا۔

''تم نے اپنا نام تو بتا دیا لیکن میرا نہیں پوچھا؟'' عورت نے ہنسی کی ایک ہلکی سی کھنک کو
اپنے لہجے کا غصہ بناتے ہوئے پوچھا۔

''اپنا نام بتانا شاید آپ کے سوالوں کا حصہ نہیں تھا ورنہ آپ کے بتانے یا میرے جاننے
میں کوئی حرج بھی نہیں تھا۔'' اعجاز کے لہجے کی جارحیت نے عورت کی پلکیں جھکوا دیں۔ وہ تھوڑا سا

ہنسی۔

''میرا نام فردوس ہے اور میں یہاں کی واحد مالک ہوں۔'' اُس نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ اعجاز یہ نا سمجھ سکا کہ اُس کا اشارہ گھر کی دیوار کے اندر تھا یا وہ باہر کی وسعتوں کو بھی نظر کی لپیٹ میں لے رہی تھی۔ دونوں کچھ دیر خاموش بیٹھے رہے۔ فردوس نے ارد گرد دیکھا۔ اُسے منشی ایک طرف کھڑا نظر آیا۔ اُس کی نظر منشی کی نظر سے ٹکرا کے واپس اعجاز کے چہرے پر آ گئی۔ ''بھوک تو نہیں لگی؟'' اعجاز کو یک دم اپنا خالی پیٹ فریاد کرتا محسوس ہوا۔ کل شام اُس نے اتنا ہی کھایا تھا کہ اُسے اب شک ہو رہا تھا کہ اُس نے کچھ نہیں کھایا۔ وہ دھیرے سے مسکرایا۔

''بہت لگی ہے۔'' اُس نے اپنی آواز میں سے شرمندگی دور رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ اُس نے سوچا کہ وہ تین آدمیوں کا کھانا کھا سکتا تھا۔

''منشی جی! کسی کو بتائیں کہ جتنی جلدی ہو سکے ناشتہ یہیں پر لے آئے۔'' اُس کی آواز میں پھر ہنسی کی ہلکی سی کھنک تھی جو اعجاز کو اچھی لگی اور اُس نے سوچا کہ شاید یہ کھنک فردوس کی گفتگو کا حصہ تھا۔

اعجاز منشی کو دیکھ رہا تھا۔ اُس نے محسوس کیا کہ منشی کو اِس طرح مخاطب کیے جانا پسند نہیں آیا۔ اُس نے ایک نظر اعجاز کو دیکھا۔ جب اُن کی نظر ملی تو منشی کے ہونٹوں پر ایک کریہہ سی مسکراہٹ پھیل گئی جیسے کہہ رہا ہوں: کب تک؟ وہ فوراً باورچی خانے کی طرف چلا گیا جو گھر سے کے ساتھ جُڑا ہوا ایک الگ حصہ تھا۔

''تم پڑھے ہوئے ہو؟'' فردوس کی آواز میں اب ہنسی کی کھنک نہیں تھی۔ اعجاز بھی اُس کے لہجے کی گمبھیرتا سے قدرے پریشان ہوا۔ وہ اُس کے اِس سوال کا کیا جواب دے؟ اُس نے سوچا کہ اُسے سچ ہی بتانا چاہیے۔

''نہیں!'' اعجاز نے اپنے جواب میں سے سبکی کو دور رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ پھر اُس نے سوچا کہ یہ جواب اُسے مکمل طور پر غیر اہم بنا دے گا۔ ''میرے حالات ہی کچھ ایسے تھے کہ شروع کی چند جماعتوں کے بعد آگے پڑھنے کے مواقع چھین لیے گئے۔'' اعجاز نے ایک لمبی سانس لیتے ہوئے اپنی محرومی کو واضح کرنے کی سعی کی۔ ''ہمارے رشتے دار نہیں چاہتے تھے کہ میں کسی بھی طرح تعلیم حاصل کر کے اُن کے لیے خطرہ بنوں چناں چہ اُنھوں نے کوشش کی کہ زندگی

میں ہڈ حرام ہی رہوں اور بن بھی جاتا لیکن کچھ ایسے لوگ بھی تھے جو اُن کے مخالف تھے اور وہ مجھے مہرے کے طور پر استعمال کرنا چاہتے تھے یا مخلص تھے اور میں ہی کم عقل تھا۔ میں اُن کی مرضی کے خلاف ایسے لوگوں سے ملنے لگا جنھیں وہ پسند نہیں کرتے تھے۔''

''میرے کچھ رشتے دار چاہتے تھے کہ میں پڑھوں۔ میں پڑھتی گئی اور مجھے شہر بھی بھیج دیا گیا کہ گھر کے معاملات نا سمجھ سکوں۔'' اُسی وقت تھال میں ایک عورت ناشتہ لے آئی۔ اعجاز کو چھابے میں رکھے دو پراٹھے، سالن، مکھن، انڈے کی بھجیا اور دہی کم محسوس ہوا۔ وہ اتنا بھوکا تھا کہ اُس نے فردوس سے پوچھے بغیر ہی تھالی میں سالن ڈال کے پراٹھے کا بڑا سا را لقمہ توڑ لیا۔ فردوس اُسے ایسی نظروں سے دیکھتی رہی جن میں حیرت، دل چسپی اور رحم تھا۔ اُس نے کسی کو اپنی بھوک کو ایسے تسکین پہنچاتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ اُس نے سوچا کہ بھوک کی شدت میں لوگ شاید ہی ایسی کھاتے ہوں کیوں کہ وہ خود اتنی بھوکی کبھی نہیں رہی تھی۔ اُس نے سوچا کہ اُسے بھوک کی شدت کا اندازہ ہی نہیں ہے۔

اعجاز جب کھانا ختم کر چکا تو اُس نے شرمندگی اور ممنونیت کے ساتھ فردوس کی طرف دیکھا۔ اُسے محسوس ہوا کہ اُس نے اپنی زندگی میں پہلی بار پیٹ بھر کے اتنا کھایا تھا۔ ملازمہ نے اُس کے سامنے سے ٹرے اُٹھا لیا اور فردوس نے ایک گہری نظر سے اُس کی طرف دیکھا۔ اعجاز کو فردوس کے ایسے دیکھنے سے اُلجھن ہوتی اور خوشی بھی کہ کوئی اُسے سمجھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اُس کا خیال تھا کہ اتنا کھانے کے بعد پھر نیند اُس پر غلبہ پا جائے گی لیکن اُسے حیرت ہوئی پیٹ بھرنے کے ساتھ ہی اُس کا دماغ چاک و چوبند ہو گیا ہے۔ اُسے وسیع گھر کی خوب صورتی کا پہلی بار احساس ہوا۔ ہر طرف پھل دار درخت تھے اور ایک طرف پھولوں کے قطعوں پر بہار تھی اور رنگ برنگی تتلیاں اٹھکیلیاں کر رہی تھیں۔ وہ تتلیوں کو ایک دوسرے کے ساتھ کھیلتے ہوئے دیکھے ہی چلے جانا چاہتا تھا۔ اعجاز کو ہر طرف زندگی کا ایک نیا رُخ نظر آیا جسے دیکھنے کا وہ عادی نہیں تھا۔ اُس چمکتی دھوپ میں اُسے گھر اپنی ہی مستی میں اونگھتے ہوئے محسوس ہوا۔

فردوس نے اپنا گلا صاف کیا۔ اعجاز نے حیرانی کے ساتھ فردوس کی طرف دیکھا۔ اُسے فردوس کا گلا صاف کرنا مصنوعی لگا اور جو وہ دیکھ اور محسوس کر رہا تھا اُسے وہی اصل دکھائی دے رہا تھا۔ فردوس ہلکا سا مسکرائی۔ اعجاز کو یہ مسکراہٹ جعلی لگی۔ ''تم پڑھنا چاہو گے؟'' اعجاز کو یہ آواز دور

سے آتے ہوئے محسوس ہوئی۔ پھر اُس نے خود کو مجتمع کیا اور فردوس کا سوال اُسے اصلی لگا۔ وہ اِس قسم کے سوال کے لیے تیار نہیں تھا۔ اُس نے ایک نظر تتلیوں والے قطعے پر ڈالی لیکن وہاں اب کوئی تتلی نہیں تھی۔ پھولوں کے مختلف رنگ تھے اور اُن رنگوں کا ایک گلدستہ تھا جو اعجاز کی آنکھوں میں گھر کر گیا تھا۔

''اگر پڑھ سکا تو ضرور پڑھوں گا لیکن اب شاید پڑھنے کو میری عمر نہیں رہی۔'' اعجاز نے سوچتے ہوئے جواب دیا۔ اُس کا خیال تھا کہ اُسے جس زندگی کی پیش کش کی جانے والی تھی اُس میں اُسے آزاد رہنا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ پڑھائی تو ایک طرح کی غلامی تھی۔ اُس نے اپنی عمر کو اِسی لیے ایک رکاوٹ ظاہر کیا تھا۔ وہ پڑھنا بھی چاہتا تھا۔ اُسے ایک دم ایسے آدمی کے تصور نے اپنی گرفت میں لے لیا جو تعلیم یافتہ ہو اور جس کی باتوں اور لہجے میں فردوس جیسا اعتماد ہو۔

''پڑھائی کے راستے میں عمر کبھی روڑا نہیں بنی۔ شکل اور گفتگو سے تم کسی بھی طرح ایک عام قسم کا لڑکا نہیں لگ رہے۔ میں چاہوں گی کہ تم پڑھو۔ اگلا فیصلہ کرنے سے پہلے تمھیں ایک یقین دہانی کروانی ہوگی؟'' فردوس کے لہجے میں اب سختی تھی اور اعجاز بھی خوف زدہ ہوا۔ وہ ہر قسم کی یقین دہانی کروانے کو تیار تھا لیکن ایسا کچھ کرنے کو تیار نہیں تھا جس سے وہ کسی قسم کی امیر خاندان کی سازش کا حصہ بن جائے۔ وہ اگر پڑھے گا تو اپنی مرضی سے اور اگر یہاں رہے گا تو وہ بھی اپنی مرضی سے۔ وہ حالات کا مارا ہوا ایک بے بس لڑکا ضرور تھا لیکن وہ کسی کے مسائل میں اپنی ذات کو اُلجھانا نہیں چاہتا تھا۔ اُس نے سوچا کہ اُسے فردوس کے سوالات کے جواب اپنی ضرورت کے مطابق دینے ہوں گے۔

''ٹھیک ہے۔ میں تیار ہوں۔''

''مجھے تمھاری وفاداری چاہیے ہوگی، میں نے تمھیں کہیں استعمال نہیں کرنا اور نا ہی تم سے کوئی فائدہ اُٹھانا ہے۔ میں تمھیں ترقی کرتے دیکھنا چاہتی ہوں۔'' فردوس کے لہجے میں تھوڑی دیر پہلے والی سختی کے بجائے بے یقینی تھی۔ وہ خالی نظروں سے اعجاز کو دیکھے جاتی تھی۔ اعجاز کو اپنی برتری کے بجائے فردوس کی بے بسی پر ترس آیا۔ وہ ایک بڑے زمین دار گھرانے سے تعلق رکھتی تھی یا پچھلے کچھ وقت میں جو اُس نے یہاں گزارا تھا اُس کا یہی اندازہ تھا اور وہ تعلیم یافتہ تھی اور اُن تمام عورتوں سے مختلف تھی جن سے وہ ملا تھا۔ اُسے اپنے اندر فیاض زندہ ہوتے

محسوس ہوا۔ اُس نے تو فیاض کا گلا دبا دینے کا عہد کیا ہوا تھا۔ وہ تو کسی عورت کو جانتا ہی نہیں تھا؛ اپنی ماں کو بھی۔ اُسے اپنے اندر ایک خنجر کھبتے ہوئے محسوس ہوا۔ وہ ماں کو پیسے بھی نہیں بھیج سکے گا اور اگر اُسے پیسے بھیجے تو دوبارہ فیاض بننا پڑے گا جب کہ فیاض کو وہ مقام کبھی نہیں ملا تھا جو اُس نے حاصل کر لیا تھا۔ فیاض تو اُس ڈھابے سے بھاگ کے اپنی ماں اور بھائی فقیر حسین کی پناہ میں چلا گیا تھا۔ اعجاز تو ایک مختلف وجود تھا۔

فردوس اُس کا چہرہ دیکھے جا رہی تھی۔ اعجاز کے چہرے کے بدلتے ہوئے تاثرات اُس کی دل چسپی کا باعث تھے۔ پھر اعجاز کے چہرے پر ایک گہرا سکون پھیل گیا۔ وہ مطمئن ہو گئی۔ ''اگر آپ میرے لیے اتنا کچھ کرنا چاہتی ہیں تو میں وفاداری کے علاوہ کچھ بھی نہیں دے سکتا۔ میری طرف سے آپ کو کبھی شکایت نہیں ہو گی۔'' فردوس اُس کی بات سنتے ہوئے اُس کے چہرے کو غور سے دیکھے جا رہی تھی۔ اُسے اعجاز کی بات میں خلوص کے ساتھ اُس کے اندر کہیں چھپی ہوئی طاقت بھی محسوس ہوئی۔

وہ مطمئن ہو گئی اور اعجاز کو اُس کے چہرے کا اطمینان بے چین کر گیا!

۰۰۰۰۰فردوس نے ابتدائی قاعدے منگوائے جنھیں اعجاز چند گھنٹوں میں ہی سمجھ گیا۔اب اعجاز کے اندر کا ناخواندہ نوجوان علم کی پیاس سے بے چین ہو گیا تھا۔فردوس اُسے پڑھاتی، قلم پکڑنا سکھاتی اور وہ گھنٹوں ایک دوسرے کے نزدیک بیٹھے کتابوں میں مصروف رہتے۔اعجاز ایک مہینے میں ہی پرائمری کر گیا اور مڈل کے ریاضی میں فردوس کو وقت پیش آ رہی تھی چناں چہ اُس نے نزدیک کے گاؤں کے میٹرک کے اُستاد کو بلوا بھیجا جس نے اُس کی تربیت شروع کر دی۔اعجاز کو شروع میں مشکل پیش آئی لیکن چند ہفتوں میں اُس نے ریاضی کے بنیادی اصول سمجھنا شروع کر دیے اور اُستاد نے اُس کی میٹرک میں اچھے نمبروں میں کامیابی کی پیشین گوئی کر دی۔اعجاز کو اپنی زندگی کا یہ رُخ پسند لگا۔گھر میں اُس کی اہمیت تھی۔وہ شروع شروع میں اِس اہمیت سے خوف زدہ ہوا، اُس کے اندر کا خوف زدہ ہرن اِسے شکاری کی ایک چال سمجھا۔وہ کسی کو کام بتاتے ہوئے ایک دم کم اعتمادی کا شکار ہو جاتا اور کسی کو تقاضا کرنے کے بجائے اپنے کام خود ہی کرتا۔اُس نے محسوس کیا کہ گھر میں موجود خدمت گزاروں کی فوج اُس کے ہر عمل اور رویے پر نظر رکھے ہوئے تھی اور وہ خود کو کبھی بے بس اور کبھی اُس پورے نظام کا سربراہ سمجھتا۔درسی کتابوں نے اُس کے اندر ایک شعور کو بھی وجود دے دیا تھا اور اُسے لگتا کہ وہ ایک بڑی تبدیلی میں سے گزر رہا ہے۔یہ سوچتے ہی وہ پریشان ہو اُٹھتا۔اگر وہ لیٹا ہوتا تو اُٹھ کے بیٹھ جاتا اور اگر بیٹھا ہوتا تو ٹہلنا شروع کر دیتا۔اُسے ایک احساسِ جرم اپنی گرفت میں لے لیتا۔اُس کی ذات کی کسی اندھیری گہرائی میں پچھتاوے کے دیے کی لو تھرتھرانے لگتی اور وہ بالٹیوں پسینے میں نہا جاتا۔وہ جو کر رہا ہے کیا اُسے کرنا چاہیے؟ وہ کیا کر رہا ہے؟ وہ ایک ایسے عمل سے بچنے کے لیے کسی انجان مقام سے بھاگا تھا جو اُس کی تذلیل کا باعث بنتا تھا؛ ڈوبنے اور مرنے والے بھی زندہ رہنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارتے ہیں اور اپنی حفاظت کرنا ہر کسی کا حق ہے سو اُس کے لیے وہاں سے بھاگنا ضروری تھا۔اب وہ اُس جگہ کو شاید پہچان ہی نا سکے۔وہ اُن بے شمار سڑک اڈوں میں سے ایک تھا جہاں وہ رکا کرتے تھے اور وہ وہاں

سے بھاگ کے یہاں کسی منصوبے کے تحت نہیں آیا تھا۔ وہ کہیں بھی جا سکتا تھا: کسی ایسی جگہ پر جہاں اُستاد سے بھی بُرے لوگ ہوتے۔ اُس نے یہاں پناہ نہیں لی؛ اُسے پناہ دی گئی تھی۔ فردوس نے پہلے دِن سے ہی اُسے گھر کا فرد قبول کر لیا تھا اور اُس نے بھی اِس گھر کو اپنا ہی گھر سمجھا تھا۔ وہ اِس انکشاف پر حیران بھی ہوا تھا کہ اُسے یہ گھر اور گھر کا اردگرد دیکھا دیکھا اور مانوس لگا تھا۔ اُسے اکثر محسوس ہوتا کہ وہ یہاں پہلے بھی کئی بار آ چکا ہے۔ پہلی نظر میں اُسے فردوس بھی دیکھی دیکھی لگی تھی اور پھر دوسری نظر میں ہی وہ ایسا چہرہ تھا جو اُس نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

بنیادی تعلیم نے اُس کے اندر ایک شعور کو وجود دے دیا تھا۔ وہ محسوس کرتا کہ وہ جہاں رہ رہا ہے وہاں اُس کا ایک مقام بنتا جا رہا ہے جسے سمجھنا اُس کے لیے لازم ہے۔ وہ یہ بھی سوچتا کہ فردوس اُسے اتنی اہمیت کیوں دیتی ہے؟ وہ اب تک جان چکا تھا کہ جہاں وہ ٹھکانا کیے ہوئے تھا وہ لوگ ڈیرے والوں سے کہیں بہتر تھے۔ ڈیرے والوں کے نزدیک ہر آدمی اُن کی خدمت گزاری کے لیے وہاں رہ رہا تھا اور اُن کا رویہ سب کے ساتھ درشت رہتا۔ گو یہاں فردوس ایک حاکم کی طرح تھی لیکن وہ سوائے منشی کے ہر کسی کے ساتھ نرم روئی روا رکھتی۔ اُسے حیرت ہوتی کہ وہ گھر کے اندر اور باہر کے معاملات یہیں سے چلا رہی تھی۔ اُس کی زمین دو تھانوں کی سرحد پر تھی اور وہ وہاں کے افسران کو سفارشات بھجواتی رہتی جو ہمیشہ قبول کی جاتیں۔ یہ مشہور تھا کہ وہ کبھی غلط یا ناجائز کام نہیں بتاتی تھی چناں چہ پولیس کا وہ نظام جو ہر کسی پر شک رکھتا تھا، اُنھیں اُس پر مکمل یقین تھا۔ جب بھی کسی ایس ایچ او کی تبدیلی ہوتی وہ پورے تھانے کے لیے اُس کا الوداعی کھانا بھجواتی اور ایسے ہی نئے تھانیدار کو بھی خوش آمدید کہا جاتا۔ محکمہ مال کے کارندے بھی اُس کے ساتھ رابطے میں رہتے اور دو نہروں کے اُس کے علاقے کے بیلدار اور میٹ ایک وقت کا کھانا اُس کے بیرونی مہمان خانے پر کھاتے؛ یہ اُن کے لیے حکم تھا۔ ڈیرے والوں نے ہر محکمے کے ساتھ حصہ رکھا ہوتا تھا جو ایک کھلا راز تھا جس کی وجہ سے سائل اپنی مجبوری کے باوجود اُن پر اعتبار نہیں کرتے تھے۔ اعجاز کا خیال تھا کہ ہر زمین دار ایسے ہی ہوتا ہے لیکن اُسے یہاں کوئی اور نظام نظر آیا اور اُسے خوشی بھی ہوئی کہ وہ اِس کا حصہ بنتا جا رہا تھا۔

فردوس اپنی نرم روئی کے باوجود سخت مزاج تھی۔ وہ جہاں کسی اچھائی کو قبول کرتے ہوئے جھجکتی نہیں تھی، وہ کسی کے قصور پر اُسے ڈانٹنے میں کسی بھی طرح بخل سے کام نہیں لیتی تھی

اور ڈانٹنے کے بعد اُس واقعہ کو بھول بھی جاتی تھی۔ اُسے حیرت ہوتی کہ فردوس نے اُسے کبھی ڈانٹا نہیں تھا۔ کئی بار وہ دیا ہوا کام نا کرتا لیکن فردوس اپنی برہمی کا اظہار نہیں کرتی تھی۔ وہ محسوس کرتا کہ فردوس ایک دم غصے میں آ گئی ہے۔ اُس کی آنکھوں میں بھرے ہوئے غصے کی سختی چہرے کی نرماہٹ کو ختم کر گئی ہے۔ وہ ایک دم خاموش ہو جاتی اور پھر اُس کا چہرہ اصلی حالت میں آنا شروع ہو جاتا اور وہیں سے ایک طویل سبق کا آغاز ہو جاتا جو تعلیم کے فوائد اور ان پڑھ رہنے کے نقصانات پر ہوتا۔ اُس گفتگو کا ہر لفظ اُسے ایک چابک کی کاٹ لیے محسوس ہوتا۔ اعجاز سوچتا کہ اتنی پُر اذیت تقریر سننے کے بجائے اُسے ڈانٹ کے چند فقرے سنا دیے جاتے تو بہتر تھا۔ فردوس جب پڑھا رہی ہوتی تو اُس کے سراپے میں اجنبیت ہوتی۔ وہ اعجاز کو کبھی احساس نا ہونے دیتی کہ وہ اُس کے ساتھ گھنٹوں باتیں کرتی رہتی ہے۔ اعجاز کے روزانہ کے معمول میں وہ طویل گفتگو دِن کا سب سے دل چسپ حصہ ہوتی۔ اُس وقت اعجاز اُس کی باتوں کے سحر میں کھو جاتا۔ جو وہ سن رہا ہوتا اپنی کسی آنکھ سے دیکھ بھی رہا ہوتا۔ وہ اپنے باپ کی باتیں کرتی۔ اُس کا باپ ان پڑھ آدمی تھا لیکن وہ پڑھے ہوئے لوگوں سے زیادہ تعلیم یافتہ تھا۔ اُس نے چند پڑھے ہوئے لوگ رکھے ہوئے تھے جو اُسے کتابیں سناتے۔ اُسے ہیر رانجھا، مرزا جٹ، اور سیف الملوک زبانی یاد تھیں۔ مردانہ مہمان خانے میں ایسی محفلیں سجتیں۔ ہیر گانے والا جب کچھ غلط پڑھ جاتا تو چودھری اُسے بے عزت کر کے نکال دیتا۔ وہ یہی کہتا کہ علم کے ساتھ ناانصافی کی جا رہی ہے۔ اعجاز یہ باتیں سنتے ہوئے وہاں اکیلا ہو جاتا۔ اُسے معلوم ہی نہیں ہوتا تھا کہ یہ واقعات اُسے فردوس سنا رہی ہے۔ اُس کے ذہن میں ایک تصویر چلنا شروع ہو جاتی۔ وہ ایک مونچھوں والے آدمی کو چارپائی پر بیٹھے ہوئے دیکھتا۔ اُس کی مونچھیں گھنی اور سر کے بال قدرے کم ہوتے۔ اُس کے ہونٹوں میں حقے کی نے ہوتی اور وہ غور سے گانے والے کو سن رہا ہوتا۔ چودھری کو انقلابی پسند تھے۔ وہ فردوس کے ساتھ انقلاب کی باتیں کرتا۔ اُسے معاشی ناہمواری پسند نہیں تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ سب کے پاس برابر کے معاشی ذرائع ہوں۔ وہ یہ سب اپنے گاؤں کے باہر دیکھنا چاہتا تھا۔ اپنے گاؤں میں اُسے صرف اپنا راج ہی چاہیے تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اُس کی رعایا میں کون بغاوت کر سکتا ہے اور اُس نے اُن باغیوں پر ہمیشہ توجہ رکھی۔ اُس نے اُنھیں کبھی اتنا محروم نہیں ہونے دیا تھا کہ وہ اُس کے خلاف اُٹھ کھڑا ہونے کا سوچیں اور نا ہی اتنا آسودہ کہ خود کو اُس

کے برابر کا سمجھیں۔ وہ اُنھیں دیتا اور کسی طرح واپس چھین لیتا۔ وہ نا تو آزاد تھے اور نا ہی بندی۔ وہ بس ویسے ہی تھے جیسے وہ اُنھیں رکھنا چاہتا۔ اعجاز نے چودھری میں سے فردوس کو تراشا۔ وہ باتیں کر رہی ہوتی اور وہ ایک ایک لفظ سنتے ہوئے کچھ بھی نا سُن رہا ہوتا۔ وہ اپنے ذہن کی چھینی سے فردوس کو تراش رہا ہوتا۔ کیا وہ اُسے بھی محروم رکھ کے اپنے پاس رکھنا چاہتی ہے؟ ہمیشہ کی طرح اُسے جواب آتا کہ اُسے اُس کی کیا مجبوری ہو سکتی تھی؟ وہ ایک بے حیثیت ہستی تھا جو بھٹکتا ہوا اُسے کے دروازے کے سامنے آن گرا تھا۔ وہ اُسے اُٹھوا کے کہیں اور پھینکوا سکتی تھی لیکن اُس نے اُسے اپنے صحن میں آنے کی اجازت دی۔ کیا وہ ایک بے مالک کتے کی طرح مالک کے ملنے پر اُس کے گرد دم ہلاتے ہوئے چکر کاٹ رہا ہے؟ وہ اُس کے اُستادوں سے خود ملتی اور ریاضی کے بارے میں جاننا چاہتی۔ اُسے اطمینان ہوتا جب اُسے بتایا جاتا کہ وہ ریاضی میں کسی بھی طرح کسی سے کم نہیں ہے۔ وہ اُس کا حوصلہ بڑھاتی اور اُسے زندگی کے اسرار و رموز سے واقفیت دلاتی۔ اُس نے اعجاز کو انگریزی اور اُردو فکشن پڑھانا شروع کر دیا تھا۔ وہ دن میں کم از کم ایک گھنٹہ کوئی نا کوئی ناول یا افسانوں کی کتاب پڑھتا۔ یہ وہ کتابیں تھیں جو فردوس نے مشہد سے علیٰحدگی اختیار کرنے کے بعد پڑھنا شروع کی تھیں۔ اعجاز جب کوئی کتاب ختم کر لیتا تو فردوس اُس سے کتاب کے بارے میں سوالات پوچھتی اور اُسے تبصرہ لکھنے کو کہتی۔ شروع میں اعجاز کے اندر کا باغی جاگ اُٹھا لیکن پھر اُس نے سوچا کہ فردوس کا ہر قدم اُس کی بہتری کے لیے تھا اور وہ کسی بھی طرح اُسے ضائع کرنا نہیں چاہتی۔ یہ سوچ اُسے طاقت دیتی اور وہ اپنے آپ کو دم ہلاتا کتا سمجھنے کے بجائے ایک اہم ہستی سمجھنے لگتا۔

اعجاز جیسے ہی اپنا خوف دور کرنے میں کامیاب ہوتا ایک نیا خوف اُس کی سوچ کی دہلیز پار کر جاتا۔ گھر کے ملازموں میں ایک افواہ گردش میں رہتی کہ گھر میں اعجاز کا مقام منشی کو پسند نہیں تھا اور وہ ہر وقت اُس کے پس منظر کے بارے میں جاننے کی کوشش میں رہتا۔ اعجاز کو اپنے حالات کے افشا ہو جانے کا کسی قسم کا ڈر نہیں تھا، وہ پہلے بھی ایک غلط بیانی کر چکا تھا اور اپنے پہلے والے بیان کو صحیح ثابت کرنے کے لیے وہ ایک اور غلط بیانی کے لیے تیار تھا۔ ملازموں میں یہ بھی افواہ گردش میں تھی کہ فردوس منشی کی طرف مائل ہونا شروع ہو گئی تھی اور اعجاز کی آمد نے اُسے منشی سے دور کر دیا تھا۔ یہ سُن کے اعجاز خوش بھی ہوتا۔ منشی اُسے پسند نہیں

تھا۔ اُس نے رفیق کے ساتھ کافی وقت گزارا تھا اور رفیق میں اُسے سوائے اچھائی کے کچھ بھی نظر نہیں آیا تھا۔ رفیق کو اُس پر مکمل بھروسہ تھا جب کہ وہ اُس کو مسلسل دھوکہ دیتا رہا تھا یہاں تک کہ عظمت کو دیکھتے ہوئے اُس کی آنکھ میں میل تھی۔ کچھ ایسا ہی معاملہ بھائی فقیر حسین کے ساتھ تھا۔ بھائی فقیر حسین ہمیشہ اُس کی بہتری کا سوچتا رہا اور وہ اُس کی بیوی کے قرب سے ایک انجانا سا لطف کھینچتا رہا تھا۔ اُستاد غیور میں بھی اُسے کوئی عیب نظر نہیں آرہا تھا۔ وہ اُس کے ساتھ اندھیری راتوں میں ایسے علاقوں میں سفر کرتا رہا تھا جہاں دِن کو بھی خوف آتا ہوگا لیکن اُستاد نے کبھی کوئی ایسی حرکت نہیں کی تھی جو اُس اجتماع میں اُس نے کسی کو کرنے کی اجازت دی۔ منشی کی آنکھ میں اُسے، ہمیشہ ایک ایسا آدمی نظر آتا جس سے کسی اچھائی کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی اور اِسی لیے فردوس شاید اُسے پسند نہیں کرتی تھی۔ اعجاز کو ایک دم خیال آیا کہ وہ اپنے نئی شخصیت میں صحیح طرح ڈھلا نہیں کیوں کہ ہر اہم موڑ پر اُسے بھائی فقیر حسین، رفیق اور اُن کی بیویاں یاد آتی ہیں۔ اُس نے پھر عہد کیا کہ اُسے اعجاز ہی رہنا ہے اور اگر اُس نے فیاض ہی بننا ہے تو اُسے وہاں جانا ہوگا جہاں کا وہ رہائشی تھا؛ یہ تو اعجاز کا گھر تھا۔

اعجاز کو لگا کہ نا تو وہ فردوس سے خائف تھا اور نا ہی منشی سے، اُسے تو صرف اپنے خوف سے خوف تھا۔ وہ فردوس کے ساتھ گھنٹوں بیٹھتا۔ پہلے وہ اُسے بلاتی تھی اور اب وہ خود اُس کے پاس جا کے بیٹھ جاتا۔ ایک دِن فردوس نے اُسے ایک کتاب میں سے ''دس روپے کا نوٹ'' پڑھنے کو کہا۔ اعجاز نے اُس رات پہلے ایک مجبوری اور بعد میں محویت کے ساتھ افسانہ پڑھا۔ اگلی ملاقات میں اُس نے فردوس کو بتایا کہ وہ افسانہ پڑھ چکا تھا۔ وہ ایک طویل بحث کے لیے تیار تھا لیکن فردوس نے نا تو کوئی سوال پوچھے اور نا ہی کوئی اپنی رائے دی۔ سوال پوچھنا اور رائے دینا اُس کا معمول تھا۔ اُس کی خاموشی سے اعجاز کو مایوسی بھی ہوئی۔ ایک دِن فردوس نے سرسری سے لہجے میں اُسے افسانے پر ایک مضمون لکھنے کو کہا جو اعجاز کو ناگوار گزرا۔ وہ لکھنے سے پرہیز ہی کیا کرتا تھا۔ اُس۔ نے رات کو افسانہ کئی بار پڑھا اور رائے لکھنا شروع کر دی۔ اُسے وہ کہانی دل چسپ لگنے کے ساتھ ایک طرح ایسی زندگی کی طرف اشارہ تھا جس سے وہ خوف زدہ بھی ہوا۔ اُسے خیال آیا کہ فردوس کو ایسی کہانی میں کیا دل چسپی تھی؟ اپنی رائے مکمل کر کے اُس نے کاغذ فردوس کے حوالے کیے اور پھر کئی دِن اپنی رائے پر اُس کے تبصرے کا منتظر رہا۔ فردوس

نے کوئی ذکر نہیں کیا۔

اعجاز خود کو ایک جنگل میں پاتا۔ اُس کے ایک طرف ماں، ڈیرے والے، رفیق، بھائی فقیر حسین، اُستاد غیور اور فیاض تھے جب کہ دوسری طرف فردوس، منشی، عالی شان گھر اور آرام دہ مستقبل تھے۔ وہ خود کو منقسم محسوس کرتا اور اُسے دھڑکا رہتا کہ وہ اِس جنگل میں کہیں کھو نا جائے۔ وہ سوچتا کہ اگر وہ کھو گیا تو آدم خور جانور اُس پر حملہ آور ہو جائیں گے۔ اُسے اپنے آپ کو بچانا تھا اور بچنے کے لیے اعجاز رہنا ہی ضروری تھا۔ وہ اعجاز کیوں رہے؟ فیاض ویگن اور ٹرک میں چھوٹا کیوں بنا تھا؟ صرف اپنا مستقبل بہتر کرنے اور ڈیرے والوں کو شکست دینے کے لیے۔ یہی کام وہ اعجاز بن کے زیادہ آسانی کے ساتھ کر سکتا تھا۔ اُسے اعجاز ہی رہنا تھا۔ ہر بار کی طرح یہ فیصلہ کر کے اُسے سکون حاصل ہوا اور وہ کسی حد تک آرام سے ہو گیا۔ اُسے اچانک خیال آیا کہ وہ فردوس کو جانتا ہے۔ اُسے دیکھ کے اُسے حیرت نہیں ہوئی تھی؛ ایسے محسوس ہوا تھا کہ وہ اُسے جانتا تھا۔ وہ اپنے ذہن پر زور دیتا رہا۔ اُسے کوئی ایسی جگہ یا موقع یاد نہیں آیا جہاں اُس کی اُس کے ساتھ ملاقات ہوئی ہو۔ لیکن پہلی نظر میں وہ اُسے شناسا سا کیوں لگی تھی؟ وہ بس ایک ہی لمحہ تھا جب وہ اُسے قریبی واقف لگی تھی اور اگلے لمحے وہ اجنبی تھی۔ اُسے پھر محسوس ہوا کہ وہ جنگل میں راستہ بھول رہا ہے اور اگر راستہ بھول گیا تو آدم خور جانوروں نے اُسے کھا جانا ہے۔ اُس نے خود کو بھٹکنے سے بچانے کا ایک بار پھر تہیہ کر لیا۔

اعجاز کا میٹرک کا نتیجہ آ گیا۔ ہر توقع کے برعکس اُس کے نمبر بہت اچھے تھے اور وہ کسی بھی کالج میں داخلہ لے سکتا تھا۔ داخلے کے فارم جمع کروانے فردوس، اعجاز کے ساتھ گئی۔ وہ بار بار اپنی خوشی کا اظہار کر رہی تھی اور اُداس بھی تھی کہ آگے کی تعلیم کے لیے اُسے شہر میں رہنا پڑے گا۔ وہ یہ بھی سوچتی کہ اعجاز جب شہر جائے تو وہ بھی ساتھ منتقل ہو جائے گی۔ وہ شہر میں چھوٹی سی رہائش کا بندوبست کر لیں اور ہفتے میں دو چکر گاؤں لگا لیا کریں تا کہ اُن کی موجودگی ختم نا ہو۔ اعجاز چاہتا تھا کہ کوئی ایسا بندوبست ہو جائے کہ وہ روزانہ کالج چلا جایا کرے تا کہ فردوس کی گاؤں کے معاملات پر کسی طرح گرفت ڈھیلی نا پڑے اور وہ دونوں اکٹھے بھی رہتے رہیں۔

فردوس نے اعجاز کو کار خرید کے دینے کا وعدہ کر لیا۔ اُس شام دونوں بہت خوش تھے۔ رات اُنھوں نے کھانے والے کمرے کے بجائے صحن میں کھانا کھایا۔ دونوں دیر تک بیٹھے

باتیں کرتے رہے اور پھر فردوس نے اُسے اپنے کمرے میں بیٹھنے کی دعوت دی۔ باہر اوس تنگ کرنا شروع ہو گئی تھی۔ یہ پہلی مرتبہ تھا کہ اعجاز نے فردوس کے کمرے میں جانا تھا۔ اعجاز کو ایک طرح خوشی ہوئی اور گہرا تجسس اُسے پریشان بھی کر رہا تھا۔ کمرہ کھلا اور نفاست وہاں کی دیواروں تک سے ٹپک رہی تھی۔ ایک دیوار پر چودھری کی تصویر لگی ہوئی تھی۔ وہ کیمرے کی طرف گھور رہا تھا اور گھنی مونچھوں کے نیچے اُس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ تھی جو اُس کے سخت چہرے پر کرختگی کے ساتھ نرماہٹ بھی پھیلائے ہوئے تھی۔ ایک دیوار کی لمبائی کے ساتھ الماری تھی جس میں کتابوں کی قطاریں تھیں۔ اعجاز نے پہلے اتنی کتابیں نہیں دیکھی تھیں۔ ایک طرف سنگھار میز تھی جس پر رنگ برنگی شیشیاں ایک ترتیب سے سجائی ہوئی تھیں۔ کمرے کے وسط میں ایک بڑا پلنگ تھا، اتنا کھلا کہ اعجاز نے سوچا کہ اُس پر کم از کم چار لوگ سو سکتے تھے۔ وہ کمرے میں ایک دوسرے کے سامنے کھڑے تھے۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے تھے۔ اعجاز کمرے میں آنے کے بعد مرعوبیت کے ساتھ ایک خوف میں بھی مبتلا تھا۔ اُسے فردوس کے اعتماد سے بھی ڈر محسوس ہو رہا تھا۔

''مجھے تمارے کالج میں داخلے کی بہت خوشی ہوئی۔'' اعجاز کی جوابی مسکراہٹ میں شرماہٹ تھی۔ ''تم ایک تھوڑے ہی عرصے میں اپنے آپ کو تبدیل کر گئے ہو۔'' فردوس نے ایک لمبی سانس لی۔ اعجاز نے جواب نہیں دیا؛ اُس کے پاس کوئی جواب ہی نہیں تھا۔ اُسے اِس تعریف پر اپنی خوشی سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا۔ ''تم پڑھنا اور میں تمھارے پڑھائی ختم کرنے کا انتظار کروں گی۔'' اعجاز کو فردوس کی آواز کہیں دور سے آتے ہوئے محسوس ہوئی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ فردوس ایسی باتیں کیوں کر رہی تھی؟ کیا وہ سچ مچ اُسے زندگی میں آگے بڑھتا دیکھنا چاہتی ہے؟ فردوس نے اُس کے گال پر ہاتھ پھیرا۔ وہ اُس کے چہرے کی کھردراہٹ محسوس کرنا چاہتی تھی لیکن اُسے مایوسی ہوئی کہ اعجاز کی داڑھی اور گال نرم تھے۔ وہ اپنی مایوسی کو اعجاز پر ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ اعجاز کی طرف تھوڑا جھکی اور اُس کی چھاتی پر اپنا سر رکھ دیا۔ ''میں ایک ویران زندگی گزارتی آئی ہوں۔'' اعجاز اُس کی آواز میں گندھے دکھ سے کانپ اُٹھا۔ اُس نے سوچا کہ وہ اُس کے لیے کیا کر سکتا ہے؟ ''میری ویرانی ختم کرو۔'' اعجاز کو فردوس کی آواز میں التجا کے ساتھ حکم بھی لگا۔ وہ یک دم مختلف کیفیات کی گرفت میں تھا۔ بے یقینی سے اُسے اپنا گلا خشک ہوتے محسوس ہوا۔ اُسے لگا کہ اُس کے

حلق میں کانٹے اُگ آئے ہیں۔اُسے اپنی ٹانگیں ربڑ کی بنی ہوئی محسوس ہوئیں۔اُس کے بازوؤں نے اُسی وقت فردوس کو اپنے گھیرے میں لے لیا۔اپنے باوؤں کی گرفت میں اُسے فردوس کا جسم کمزور اور بے سہارا لگا۔اعجاز کو اپنے اندر بے پناہ طاقت کا احساس ہوا۔

''کیسے؟'' اعجاز کی آواز ایک سرگوشی بھی نہیں تھی اور وہ حلق کے کانٹوں میں سے اُلجھتی ہوئی ایسے آئی جیسے پتھر پر ریتی کو رگڑا جا رہا ہو۔اِس غیر متوازن آواز میں سے رگڑ کھا کے نکلتی آواز میں ایک شوکر بھی تھی۔فردوس کو اِس شوکر میں ایک طاقت نظر آئی؛ ایسی طاقت جس کے سامنے وہ بے بس تھی۔

''مجھے سیراب کر کے۔میرے اندر کی ہر ٹہنی خشک ہوگئی ہے۔ایسے سیراب کرو کہ ٹہنیوں پر کونپلیں پھوٹنا شروع ہو جائیں۔'' فردوس کی سرگوشی مدھم اور بھاری تھی۔وہ ماتھا اعجاز کی چھاتی کے ساتھ رگڑے جا رہی تھی اور اُس کا سانس رُک رُک کے نکل رہا تھا۔اُس کے گرد اعجاز کے بازوؤں کی گرفت مظبوط تھی لیکن وہ مچھلی کی طرح وہاں سے نکل گئی۔''مجھے اُٹھاؤ۔'' اب اُس کی آواز میں ایک حکم تھا۔اعجاز کو لگا کہ اُس کے سامنے چند لمحوں والی نرماہٹ سے بھرپور عورت کے بجائے دیوار پر ٹنگی تصویر کی طرح کرختگی کے عکس سے بھرپور عورت اُسے اُکسا رہی ہے۔اعجاز نے اچانک اُسے اتنی طاقت سے اُٹھایا کہ فردوس کی چیخ نکلی اور پھر وہ کھلکھلا کے ہنس پڑی۔اعجاز کو اُس ہنسی میں ایک پاگل پن نظر آیا۔''مجھے پلنگ پر دھڑام سے پھینکو۔'' اُس نے سرگوشی کی۔اُس کی سرگوشی میں مٹھاس، گداز اور بھاری پن تھا اور اعجاز کو کہیں بھی پاگل پن نظر نہیں آیا۔اُسے اپنے اندر کوئی قابض ہستی محسوس ہوئی۔وہ ہمیشہ ایک خوف کی گرفت میں رہا تھا؛ اُسے کبھی خود پر اعتماد نہیں رہا تھا لیکن اِس وقت اُس میں صرف اعتماد تھا۔وہ فردوس کو اُٹھائے ہوئے تھا اور پلنگ صرف دو قدم کے فاصلے پر تھا۔اُس نے پہلا قدم اُٹھایا اور فردوس اُس کی بانہوں میں کسمسائی۔''مجھے کہاں لیے جا رہے ہو؟'' فردوس کی سانس پھولی ہوئی تھی اور رکتی ہوئی سانسوں میں وہ ہنسے بھی جا رہی تھی۔اعجاز نے جواب میں اُس کے گرد گھیرا مزید تنگ کر دیا اور فردوس نے قہقہہ لگایا۔

وہ بستر پر تھے اور اُن کے بدن حرکت میں۔وہاں نرماہٹ تھی اور گیلاہٹ، وہاں سختی کا جوبن تھا اور دبی دبی آہیں، سرگوشیاں تھیں اور گھٹی گھٹی ہنسی، دبائی ہوئی چیخ تھی اور روح تک اُتر جانے والی خاموشی۔فردوس کو لگا کہ وہ راستہ گم کر کے کسی جنگل میں گم گئی ہے۔وہ راستہ ڈھونڈتے

ہوئے بھاگی پھر رہی ہے؛ وہ ہانپتے ہوئے بھاگ رہی تھی اور بھاگتے ہوئے ہانپ تھی۔ وہ اپنی ہستی کو کھوئے جارہی ہے۔ اُسے اپنے ساتھی کی کہیں دور سے پکار سنائی دی۔ وہ اُس پکار کی سمت کا تعین کر کے اُسی طرف بڑھے چلی جارہی تھی اور جیسے ہی اُسے ساتھی کا ہیولا دکھائی دیا وہ تھک کے گرگئی۔ اعجاز اب تنہا تھا اور پھر اُس کی تنہائی ایک طویل آہ میں تبدیل ہوگئی۔ اب وہ دونوں خاموش تھے؛ کچھ تھکے ہوئے اور کچھ تازہ دم۔ ''ہم پہلے کبھی ملے ہیں؟'' اعجاز کو یہ موقع سچ بولنے اور سننے کا لگا۔ یہ صبح کا وہ وقت تھا جب زیست ابھی جاگی نہیں ہوتی اور جو بھی سوچ ذہن میں آئے سچ ہوتی ہے۔ ''مجھے لگتا ہے کہ ہم ملے ہوئے ہیں۔'' اعجاز کو اپنی آواز میں بے یقینی بھی محسوس ہو رہی تھی۔

فردوس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ اعجاز کو قہقہے میں دل چسپی کے ساتھ ایک خوف بھی محسوس ہوا۔

''ضرور ملے ہوں گے۔'' فردوس نے اعجاز کی گردن کو محسوس کرتے ہوئے جواب دیا۔

''پہلی مرتبہ جب ہم ملے تو تم مشہد تھے۔ تم وہ امیر آدمی تھے جو مجھے آسودگی نہیں پہنچا سکتے تھے تم مجھے محروم رکھنا چاہتے تھے۔ میں شاید خود غرض تھی اِس لیے تمھارے محل سے باہر نکل گئی۔ اگر میں وہاں رہتی تو یہاں نا ہوتی اور جو میں نے پایا نا پاسکتی۔ دوسری مرتبہ جب ملی تو تم خود سے بھی خائف ایک لڑکے تھے۔ میں تمھیں جانتی تھی اور تم بھی مجھے جانتے تھے۔'' فردوس نے ایک لمبی سانس لی۔ وہ کسی خیال میں گم تھی۔ اعجاز اُلجھا ہوا ساچھت کو دیکھتے ہوئے فردوس کے کہے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ مشہد کون تھا؟ فردوس کا اُس کے ساتھ کیا تعلق تھا۔ اُسے اچانک فردوس ایک پیچیدہ شخصیت لگی۔ وہ مشہد اور اُسے ایک ہی آدمی ظاہر کر رہی تھی۔ کیا وہ کبھی کسی مشہد سے ملا ہے؟ وہ ایسے کسی شخص سے نہیں ملا جس کا نام مشہد ہو! فردوس کو یقیناً کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔

''مجھے تم اپنی ضرور لگی تھیں لیکن میں کسی مشہد کو نہیں جانتا۔'' اعجاز کو فردوس کے قہقہے سے تھوڑی اُلجھن بھی ہوئی۔ وہ ایک پریشانی میں مبتلا تھا اور وہ حل بتانے کے بجائے ہنسے جارہی تھی۔ وہ کچھ دیر پہلے کی فردوس کے بدن کی لذت بھول چکا تھا اور اُس کا ذہن مشہد کے جالے میں اُلجھا ہوا تھا۔

''دس روپے کا نوٹ' یاد ہے؟''

''یاد ہے۔'' اعجاز کی آواز میں حیرت اور بے یقینی تھی۔ اُس کے ذہن میں پوری کہانی گھوم گئی اور اُسے کہانی کا ذکر پسند نہیں آیا۔ یہ کہانی پر تجزیاتی گفتگو کرنے کا وقت نہیں تھا۔ یہ تو ایک

نازک قسم کا وقت تھا۔

''مشہد اُس کہانی کا ایک کردار تھا اور مجھے اُس سے محبت تھی۔'' فردوس خاموش ہوگئی۔ اعجاز کو محسوس ہوا کہ وہ رو رہی تھی۔ اُسے اچانک فردوس اپنی تمام طاقت کے باوجود کمزور لگی؛ اتنی کمزور کہ اُسے اُس پر ترس آنے لگا۔ وہ جو ایک بے خانماخراب تھا اب خود کو طاقت ور محسوس کر رہا تھا۔ اُس نے فردوس کو اپنی بانہوں میں لے لیا۔ ''مجھے اُس سے محبت تھی۔ میری خودغرضی کے باوجود وہ محبت میرے اندر زندہ تھی یا میں نے اُسے زندہ رکھا ہوا تھا۔ ''دس روپے'' کا نوٹ بھی تمھیں اِسی لیے پڑھا تھا کہ شاید تم سمجھ جاؤ۔ آج وہ محبت مر گئی یا میں نے اُسے مار دیا۔'' فردوس نے ایک لمبی سانس لی اور اُس کے ساتھ چمٹ گئی۔

وہ ایسے ہی لیٹے رہے؛ تھکے ہوئے سے!

.....کمرے میں خاموشی قابض تھی اور وہ اِس خاموشی میں لیٹے ہوئے تھے۔ دونوں کے درمیان تھوڑی دیر پہلے والی قربت کی رفاقت نہیں رہی تھی اور دونوں ایک دوسرے سے لاتعلق سے لیکن ایک دوسرے کو تھامے ہوئے لیٹے تھے۔ اعجاز کو فردوس کا ایک ناکارہ مرد کے ساتھ محبت میں گرفتار رہنا سمجھ نہیں آرہا تھا۔ وہ اتنے سال ایک خشک درخت کا سایہ ڈھونڈتی رہی اور اُسے اُس کے حوصلے اور صبر پر حیرت بھی ہورہی تھی۔ اُسے اپنی زندگی کے تجربات فردوس کے ایک تجربے کے مقابلے میں غیراہم اور معمولی لگے۔ تھوڑی دیر پہلے فردوس اُسے اپنی طاقت کے باوجود ایک کمزور عورت لگی تھی لیکن اب اُسے خیال آیا کہ وہ کسی بھی طرح ایک کمزور عورت نہیں تھی اور یہ اُس کی اپنی سوچ کی کمزوری تھی کہ اُس نے فردوس کو کمزور سمجھا تھا۔ فردوس اُس کے ساتھ اپنی زندگی کے ایک اہم راز کی ساجھے داری کر چکی تھی اور اگر وہ ایسے نا کرتی تو اُس نے جان ہی نہیں پانا تھا۔ اب وہ فردوس کو جان گیا تھا۔ وہ ایک بنجر کھیت کی طرح تھی جو آج سیراب ہوگیا تھا۔ وہ خود بھی پہلی مرتبہ ایک ایسی لذت سے ہم کنار ہوا تھا جو اُس وقت سے اُس کی سوچ کے کسی نا کسی حصے پر قابض رہی تھی جب سے اُستاد غیور نے عورتوں کے جسموں کو کھول کے بیان کیا تھا۔ فردوس نے اُسے اپنے ایک ناکارہ عشق کے متعلق خود بتایا۔ سنا تو یہ تھا کہ عورتیں اپنے معاشقوں کی عاشقوں کے ساتھ ساجھے داری نہیں کرتیں۔ کیا وہ اُس کا عاشق تھا؟ عاشق کیا ہوتا ہے؟ کیا عشق جسمانی لذت کے دینے یا لینے کا نام ہے؟ اگر فردوس نے اُسے ایک انجانی لذت سے متعارف کروایا تھا تو اُس نے بھی اُسے مشہد کے ہیولے سے چھٹکارا دلوایا تھا۔ سو یہ عشق تو نہیں ہوسکتا۔ ایک بار پھر وہی سوال: کیا وہ فردوس کا عاشق تھا؟ کیا عشق کسی کا ہر وقت سوچ میں بسے ہونا ہوتا ہے؟ اگر ایسے ہے تو اُسے فردوس کے ساتھ عشق ہے۔ وہ ہر وقت اُس کے متعلق سوچتا رہتا ہے اور جب وہ سامنے آتی ہے تو اُسے دیکھے ہی چلے جانا چاہتا ہے۔ کئی بار فردوس کو دیکھتے ہوئے جب اُن کی نظریں ملیں تھیں تو اُسے شرمساری سے سر جھکانا پڑا تھا۔ یہ وہ چوری تھی جو وہ کیے جانا چاہتا تھا لیکن پکڑے جانا اُسے

پسند نہیں تھا۔

وہ ایک دوسرے کو تھامے ہوئے خاموش لیٹے تھے۔ اعجاز کو یہ بھی پریشانی تھی کہ فردوس کیا سوچ رہی ہوگی؟ کیا جاننا ضروری تھا؟

''تم کسی اُلجھن میں ہو؟'' فردوس کی سرگوشی نے اُسے چونکا دیا۔ اُسے فردوس کی آواز میں دوری اور نیند کا احساس ہوا۔ اُس نے سوچا کیا وہ سو رہی تھی اور ایسے تو نہیں کہ اُس نے اُسے جگا دیا ہو؟

''نہیں! مجھے کیوں اُلجھن ہوگی؟'' اعجاز کو اپنی آواز میں برہمی کا احساس ہوا۔ اُسے اپنے خیالات کے سلسلے کا ٹوٹ جانا اچھا نہیں لگا۔ اُسے ایسے لگ رہا تھا کہ وہ ایک سیدھے راستے پر سر جھکائے چلے ہی جا رہا تھا۔

''لیٹے لیٹے تمھارے بدن میں ایک دم کھچاؤ آ جاتا ہے؟'' اعجاز کو محسوس ہوا کہ کسی نے اُسے چوری کرتے پکڑ لیا ہے۔ وہ یہ سب کچھ اپنی ذات کے اندر رہتے ہوئے ہی سوچ رہا تھا اور یہ وہ سوچیں تھیں جو ذہن میں ہر وقت چلتی ہی رہتی ہیں اور جو کسی کو پتا بھی نہیں چلتیں؟ فردوس تو سمجھ گئی تھی کہ اُس کا جسم کسی سوچ یا کشمکش کی وجہ سے کھچ جاتا ہوگا لیکن وہ نہیں جان سکا کہ فردوس بھی کسی اُلجھن میں گرفتار ہے یا نہیں۔ اگر وہ آسودہ سا لیٹا مسلسل سوچے جا رہا تھا تو وہ بھی ایسی کسی حالت میں ہوگی لیکن وہ اُس کے بدن میں کسی قسم کی حرکت یا تبدیلی کیوں نہیں محسوس کر رہا تھا؟ کیا یہ فردوس کے زیادہ تعلیم یافتہ ہونے یا عمر میں بڑے ہونے کے تجربے سے تھا؟ کیا عمر میں بڑی عورت کے ساتھ عشق کیا جا سکتا ہے؟ اب اُسے اپنے بدن میں ایک کھچاؤ محسوس ہوا۔ اُس نے سوچا: کیا یہ کھچاؤ فردوس نے بھی محسوس کیا ہوگا؟ اگر اُس نے اِس کھچاؤ کی وجہ پوچھی تو کیا وہ بتا سکے گا؟ فردوس اُس سے عمر میں بڑی تھی لیکن دونوں زندگی کے بظاہر مختلف، لیکن اگر سرے جوڑے جائیں تو ایک ہی قسم کے تجربات اور حادثات سے گزر رہے تھے۔ اُسے ایک ایسا آدمی ملا تھا جو نسلی طور پر نامرد تھا اور وہ فردوس کے ساتھ خچر کی طرح ہی رہنا چاہتا تھا۔ گاؤں میں اُس نے بھائی فقیر حسین کو کسی کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے سنا تھا کہ نر اور مادہ خچر بچہ پیدا کرنے کے اہل نہیں ہوتے اور اور اُس آدمی اور فردوس کا ملاپ بھی نر خچر اور گھوڑی یا گدھی والا ہی ہونا تھا۔۔ اُسے ایک دم بھائی فقیر کا یاد آنا واپس فیاض کے پاس لے گیا۔ اُسے بھائی فقیر حسین کی وہ کتاب یاد آ گئی جس

میں مختلف حلیوں والی عورتوں کی خصوصیات لکھیں تھیں۔ اگر کتاب اردگرد ہوتی تو وہ فردوس کی خصوصیات بھی جاننے کی کوشش کرتا۔

اُس نے سوچا: اگر سرے جوڑے جائیں تو وہ دونوں ایک ہی قسم کے تجربات اور حادثات سے گزرے تھے! اُس کو اُستاد غیور ملا تھا جو اُسے خود تو نہیں لیکن دوسروں سے استعمال کروانا چاہتا تھا اور مشہد نے اپنے خاندان کی روایت کو برقرار رکھتے ہوئے فردوس کے بھی کسی کرائے پر لائے ہوئے سانڈ سے حمل ٹھہروانا تھا۔ فردوس نے یہ سب نہیں ہونے دیا لیکن وہ وہاں سے بھاگی نہیں۔ اُسے بھاگنے کی ضرورت نہیں تھی۔ مشہد اِس قابل ہی نہیں تھا کہ وہ اُسے روک سکتا اور وہ ایک شان بے نیازی کے ساتھ گھر سے باہر نکل گئی ہوگی جب کہ اُس کے اپنے پاس بھاگ جانے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔

''تم نے اُس نامرد اور اپنے بارے میں مجھے کیوں بتایا؟'' اعجاز کو اپنی آواز میں کچھ اجنبیت لگی اور وہ سوال پوچھ کے کچھ خوف زدہ بھی ہوگیا۔ اُسے خیال آیا کہ تھوڑی دیر پہلے کی بے تکلف ہم بستری کے باوجود وہ مکمل طور پر فردوس کے رحم و کرم پر تھا؛ وہ اُس کا مستقبل ترتیب دے رہی تھی جو اُسے اب روشنی میں نہایا ہوا نظر آرہا تھا۔ فردوس نے ایک لمبی سانس لی اور اعجاز کو اُس کے جسم میں جھرجھری کا احساس ہوا۔ اُسے فردوس کے جواب کے انتظار میں اپنے بدن میں ایک کھچاؤ محسوس ہوا؛ شاید یہ وہی کھچاؤ تھا جسے وہ تو نہیں لیکن فردوس محسوس کرتی رہی تھی۔ وہ بہت دھیمے سے ہنسی؛ اتنی مدھم سی ہنسی کہ اعجاز کو سننے میں بھی دقت ہوئی۔

''یہ بتانا ضروری تھا۔ میں اپنے دماغ پر ایک بوجھ لیے پھر رہی تھی۔ مجھے محسوس ہوتا تھا کہ اُس آدمی کی قید سے رہائی ہی مجھے خود مختار کرے گی اور یہ رہائی کسی کے ساتھ ساجھے داری کے بعد ہی ملنی تھی لیکن میں کس کے ساتھ ساجھے داری کرتی؟ اپنے باپ کے ساتھ؟ وہ شاید مجھے مروا دیتا۔ اپنی پھوپھی کے ساتھ؟ اگر میرا باپ مجھے زندہ رکھنے کا فیصلہ کر لیتا تو پھوپھی نے طعنے دے دے کے اُسے مجھے مارنے پر مجبور کر دینا تھا۔ کیا میں منشی کو بتاتی جو مجھے ورغلانے کی کوشش میں تھا؟ میں تمھیں بھی نہیں بتا سکتی تھی کیوں کہ تم میرے معاملات کے خاکوں کا حصہ نہیں تھے۔ تمھارے ساتھ جسم کی ساجھے داری میری مجبوری تھی۔ اگر تمھارے ساتھ نا کرتی تو کوئی اور ہوتا؛ کسی جذباتی وابستگی کے بجائے ایک جسمانی ضرورت کے تحت۔ لیکن تم نے مجھے جس طرح نچوڑ

کے خالی کر دیا اُس کے بعد تم سے کچھ بھی مخفی رکھنا اِس رشتے کی توہین تھی۔'' فردوس نے پھر لمبی سانس لی۔ اعجاز کو اپنے ساتھ چھوتا ہوا اُس کا بدن ڈھیلا لگا جیسے اُس میں اب کوئی توانائی نا ہو۔ اُسے فردوس کے ڈھیلے، تھکے ہوئے مگر گرم بدن میں طاقت کی ایک رو بہتے ہوئے محسوس ہوئی جو اعجاز کو بھی طاقت دے رہی تھی۔ اُسے فردوس کے اعتراف نے خود اعتمادی سے بھر دیا تھا اور اُسے محسوس ہوا کہ اگر فردوس اُسے قابلِ تعریف سمجھتی ہے تو وہ حقیقتاً قابلِ تعریف ہی ہوگا۔

فردوس کے اعتراف نے اُسے ایک طرح سے شرمندگی کے گدلے پانی والے گڑھے میں پھینک دیا تھا۔ اُسے اپنے ساتھ جُڑ کے لیٹی ہوئی کمزور اور بے سہارا عورت اتنی کمزور نہیں لگی جتنا وہ سمجھ رہا تھا۔ اُس نے اُسے اپنے ساتھ جسمانی ساجھے داری کے لیے اُکسایا، پھر اُس کی کارکردگی کو سراہا جب کہ وہ جانتا ہی نہیں تھا کہ بستر میں عورت کے ساتھ جنسی عمل میں کارکردگی بھی دکھائی جاتی ہے۔ سب سے اہم بات اُس کا اپنا کسی کے ساتھ جذباتی کشش کا اعتراف کرنا بھی تھا۔

''تم ایک بڑی عورت ہو جس نے مجھ سے چھوٹے اور بے گھر کو یہ عزت دی کہ ہم دونوں کو کوئی چیتھڑا بھی نہیں ڈھانپے ہوئے۔ میں ایک اعتراف کرنا چاہتا ہوں۔'' وہ خاموش ہو گیا۔ وہ فردوس کا اپنے ساتھ جُڑا ہوا بدن کھچتے ہوئے محسوس کر سکتا تھا۔ اُس نے سوچا: کیا یہ کسی خوف کی وجہ سے تھا یا فردوس کو کوئی اُمید تھی؟ اُس نے محسوس کیا کہ فردوس نے اثبات میں سر ہلایا ہے۔ اُسے یہ بھی لگا کہ یہ اُس کا وہم ہے لیکن اُس نے اِس وہم کو سچ ہی سمجھا، ''میرا نام اعجاز نہیں۔'' وہ رکا۔ اُسے فردوس کا بدن ایک دم سکڑتے ہوئے محسوس ہوا۔ اُس نے سوچا کہ یہ اعترافات کا موقع نہیں ہے پھر اُسے خیال آیا کہ ایک اتنے پُرخلوص ملاپ کے بعد اعترافات کا بہتر موقع کون سا ہو سکتا ہے؟ فردوس بھی اپنے نامرد عاشق کے ساتھ اپنے تعلق کا بتا چکی تھی۔ ''میں فیاض ہوں اور ہم انقلابی ہی ہیں۔ میں ایک ٹرک پر چھوٹا تھا اور میرے ڈرائیور نے مجھے اپنے ایک دوست کے حوالے کرنا چاہا تا کہ وہ میرے ساتھ بدفعلی کر لے لیکن میں وہاں سے بھاگ نکلا۔ مجھے اُس جگہ کا کچھ پتا نہیں کہ کہاں ہے اور میں ایک سمت میں بھاگتا ہی رہا، اُس وقت تک بھاگتا رہا جب تک یہاں نا آ گیا۔'' فردوس کا بدن اُسی طرح ڈھیلا اور بے جان تھا۔ اُسے لگا کہ وہ سو گئی ہے لیکن اعجاز کو خاموش رہنا ممکن نہیں لگا۔ اُسے محسوس ہوا کہ اگر وہ خاموش ہو گیا تو اُس کا سانس بند ہو جائے

گا۔'' مجھے فیاض سے اعجاز بننا ایک مشکل کام لگا تھا۔ میرے لیے ایک پہچان سے دوسری میں تبدیل ہونا آسان نہیں تھا۔ مجھے کبھی بھائی فقیر حسین اور اُس کی بیوی یاد آتے اور کبھی رفیق اور عظمت۔ سچ تو یہ ہے کہ مجھے اپنی ماں بہت کم یاد آئی۔ شاید اِس لیے کم یاد آئی کہ میں اُسے یاد کرنے سے ڈرتا تھا۔ ڈرائیور کا نام اُستاد غیور تھا اور وہ مجھے ہمیشہ بتاتا کہ وہ ماں کو منی آرڈر کرتا رہتا ہے جو بھائی فقیر حسین کے نام ہوتے۔ وہ پیسے ماں کو پہنچا دیتا تھا۔ اب کئی سالوں سے وہ پتا نہیں کس حال میں ہو۔'' اُس نے آہ بھری اور کچھ دیر خاموش رہا۔ فردوس اُسی طرح بے جان سی لیٹی ہوئی تھی۔'' پتا نہیں کہ زندہ بھی ہے کہ نہیں۔'' فردوس کے بے جان جسم میں حرکت نے اُسے چونکا دیا۔ اُسے لگا کہ بلی اپنے شکار پر جھپٹ پڑی ہے۔ وہ اُس کے ساتھ چمٹ گئی۔'' مجھے فیاض سے اعجاز میں بدلنا مشکل لگا تھا لیکن واپس فیاض بنتے کوئی مسئلہ ہی نہیں ہوا۔''

''ہاں جیسے تم اپنی ماں کو بھول چکے تھے، اب کل ہم اُسے ملنے جائیں گے۔''

یہ کہہ کے فردوس نے فیاض کو کھینچ کے اپنے اوپر کرلیا!

ختم شد

گوجراں والا چھاؤنی

◆◆ ◆ ◆◆
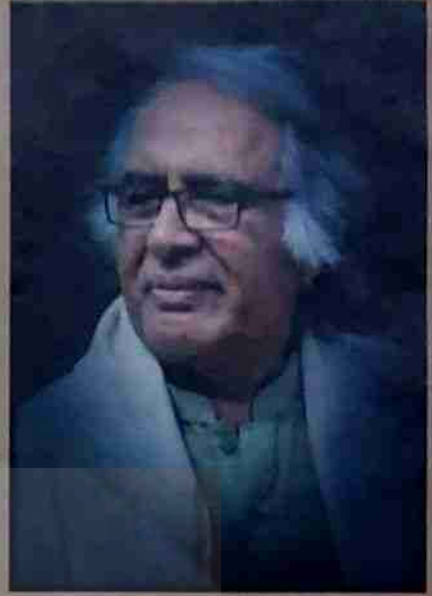
ناول نگاری میں کہانی گر اگرچہ پاؤں پاؤں کہانی میں اترتا ہے مگر عمومی طور پر اپنے نقشِ پا سے جان نہیں چھڑا پاتا اور یوں ہر کردار میں سانس لیتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اگر یہ وصف ہے تو خالد فتح محمد کے ہاں نہیں ہے اور اگر یہ عیب ہے تو وہ اِس سے ماورا ہے۔ خالد فتح محمد نے عمر کے جس حصے میں کہانی نقش کرنا شروع کی وہاں تک آتے آتے اکثر کہانی کاروں کے سانس پھول چکے ہوتے ہیں مگر داد دیجئے خالد صاحب کو کہ ہر بار وہ ایک نئے ہنر سے کینوس بچھاتے ہیں، رنگ بکھیرتے ہیں، تصویر بناتے اور قاری کو اِن رنگوں کے سحر اور نقوش کی پُرکاری میں جکڑ کر نرالی تب وتاب سے ایک نیا ناول آغاز کر چکے ہیں کچھ اِس طرح سے کہ داستانِ گذشتہ کا عکس تک نہ تو اُن کی بُنت میں دکھائی دیتا ہے اور نہ ہی اُن کے جدید آمدہ کرداروں کے لب ولہجہ میں۔ خالد فتح محمد لایعنی فلاسفی اور غیر موثر پند ونصائح سے چنداں تعلق نہیں رکھتے۔ وہ انسانوں کے انسانی رویوں کو مشاقی سے جانچتے، پرکھتے اور نتھارتے ہیں۔ کردار اُن کے سنگی اور کہانی کا بہاؤ اُن کے قلم کی جنبش کا رہین ہونے کی بجائے کرداروں کے فطری تعامل سے عمل میں آتا ہے۔ میں وثوق سے کہتا ہوں کہ اُردو فکشن پر چھائی ہوئی یبوسیت کو اتار پھینکنے کے بعد انہوں نے ناول گری کو بُنت اور بیان کے نئے اور موثر ہنر سے آشنا کیا ہے۔

حفیظ خان

(تمغۂ امتیاز)